قبرِ اویس پر ہے بس فخر اب قرن کو
لیکن اویس کوئی باقی نہیں قرن میں
(حالی)

اویس قرنی رضؓ

سید بشیر احمد سعدی ہاشمی

مکتبہ پاکستان
چوک انارکلی لاہور

انتساب

اپنے محترم بزرگ الحاج شجاعت علی صاحب صدیقی

ریٹائرڈ ملٹری اکاؤنٹنٹ جنرل پاکستان کے نام

سعدی سنگروزی

۱۲ - ۹ - ۷۰

۹ - دھنی رام روڈ، انارکلی لاہور

ماخذ

۱- شذرات
۲- تاریخ خطیب
۳- طبقاتِ کبریٰ
۴- صحیح مسلم
۵- ابن سعد
۶- مستدرک حاکم
۷- اصابہ جلد اوّل
۸- صفوۃ الصفوہ
۹- تذکرۃ الاولیاء
۱۰- ابن عساکر
۱۱- مقامات احسان
۱۲- فتوحات مکیہ

پہلی بار ۱۹۷۱ء
ناشر محمد حنیف چودھری
مطبوعہ نقوش پریس لاہور

تمہید

زیرِ نظر کتاب حضرت اویس قرنیؓ کے حالات کے بارے میں لکھی گئی ہے جن کا اہلِ تصوف کے نزدیک بہت اونچا مقام ہے۔ تصوف کی تعریف اور غرض وغایت کیا ہے اور اہلِ تصوف کون ہیں مختصراً یوں سمجھیے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں ہر انسان اپنی جان کھپائے اور پوری طرح اس کا ہو جائے۔ دنیا اور دنیا کی خرافات سے منہ موڑ لے اور ان تمام چیزوں سے جن پر دنیا دار مٹے ہوتے ہیں یکسر ہاتھ اٹھا لے۔ جب دوسری صدی ہجری میں حکومت اور سلطنت کے باہمی جھگڑوں سے مسلمانوں کی وحدتِ ملی پارہ پارہ ہونے لگی تو اسلام کے وہ اطاعت گزار جو گذشتہ تنہائی میں بیٹھے یادِ خدا میں لگے ہوئے تھے مسلمانوں کی اصلاح اور اسلام کی تبلیغ اور اشاعت کے لئے میدانِ عمل میں نکلے وہ "صوفی" کے نام سے مشہور ہوئے اور اسی اعتبار سے ان کے مسلک نے تصوف کا نام پایا۔

علامہ قشیریؒ اس خیال سے متعلق کہ صوفی، کس نقطہ سے نکلا ہے علمائے اسلام کے مختلف اقوال پیش کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ صوفی کے بارے

میں یقین کے ساتھ تو نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کس لفظ سے نکلا ہے البتہ ہم اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ صوفی کا لفظ ایک لقب کے طور پر ضرور استعمال ہوتا ہے اور بس!

علامہ قشیریؒ کہتے ہیں کہ جو لوگ خیال کرتے ہیں کہ صوفی کا لفظ صَفا یا صفت سے نکلا ہے انہیں دھوکا ہوا ہے، اسی طرح جو لوگ سمجھتے ہیں کہ صوفی حضرات صوف پہنا کرتے تھے اس لئے صوفی کہلائے وہ بھی مغالطے میں ہیں کیونکہ صوف تو وہ لوگ بھی پہنتے تھے جو صوفی نہیں تھے۔ ہاں اگر صوف کی معنوی رعایت سے اس بات کی طرف اشارہ کر کے انہیں صوفی کہا جائے کہ وہ لوگ دنیاداروں کی طرح زرق برق لباس کے بجائے جھوٹا موٹا، ایک سادہ سا لباس پہنتے تھے اور زندگی ان کی بہت سادگی میں بسر ہوتی تھی تو صوفی کے لفظ کے بارے میں یہ بات زیادہ صائب اور یقیناً قرین قیاس ہو گی۔

الغرض اس لحاظ سے کہ صوفی، دنیا کے لہو و لعب سے بیزار اور دین کی محبت میں سرشار ہونے کا نام ہے بلاشبہ حضرت اویس قرنیؓ بقول حضرت مخدوم سید علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کے اس لحاظ سے تمام صوفیوں میں مقدم اور نہایت محترم شخصیت ہیں لہٰذا اگر تصوف کی معنویت کو سامنے رکھتے ہوئے آپ کی ذات والا صفات کو جانِ تصوف کہا جائے تو ہرگز بے جا نہ ہو گا۔

زیر نظر کتاب میں ہم نے حضرت اویس قرنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حالات و سیرت کو اسی نقطہ نظر سے پیش کیا ہے اور اس سلسلے میں بہت سے مستند ماخذ سے مدد لی ہے مگر تاریخ کے نقطہ لحاظ سے ہمیں جہاں کہیں

کسی روایت سے متعلق اختلاف ہوا ہے اسے تاریخی دلائل سے حتی الوسع واضح کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ اگرچہ اویس قرنی کے زمانے میں تصوف اور صوفی وغیرہ الفاظ سننے میں نہیں آئے تاہم اصحاب صفہ کے ہاتھوں تصوف کی بنیاد ضرور پڑ چکی تھی۔ تصوف کیا ہے، اور صوفی کون ہے، کس زمانے میں اس کا نام سنا گیا یوں سمجھئے کہ جس زمانے میں کوفہ، بصرہ اور مصر کے غیر تربیت یافتہ اور نام نہاد مسلمانوں کی بدولت دنیائے اسلام کے مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد خارزار سیاست میں الجھ کر باہم دست و گریباں تھی اور وحدت ملی کے ٹکڑے ٹکڑے ہو رہے تھے۔ اسلام کے دین کی ایک جماعت اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور توحید الٰہی کے درس و تدریس کے لئے نہایت خاموشی سے اٹھی اور مصروف عمل ہو گئی یہ جماعت یا اس کے افراد کون تھے بس اتنا جان لیں کہ صحابہ کے بعد تابعین اور تابعین کے بعد تبع تابعین، پھر ان کے بعد علمائے کرام کا گروہ آتا ہے جو مسلمانوں کی اصلاح کے لئے نہایت جرأت کے ساتھ کام کر رہا تھا اور حضور سرور کائنات، مکی، مدنی، قریشی، ہاشمی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین برحق کو دنیا کے کونے کونے میں پھیلا رہا تھا۔

ان بزرگوں نے اسلام کے دین کی سیدھی سادی توحید کی اعلیٰ تعلیم اور خدا کے ایک واضح اور آسان تصور کو کسی رمز و کنایہ، تشبیہ و استعارے کے بغیر نہایت عمدہ پیرائے اور صاف صاف لفظوں میں پیش کیا۔ الغرض یہی وہ لوگ ہیں جنہیں علم تصوف کا بانی مبانی کہا جا سکتا ہے۔ ان میں علم تصوف کی عہد بعہد ترقی کے لحاظ سے اصحاب صفہ کے بعد حضرت اویس قرنی، حضرت خواجہ حسن بصری،

امام سفیان ثوری، حضرت رابعہ بصری ——— حضرت حبیب عجمی، حضرت داؤد طائی، حضرت فضیل بن عیاض اور سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی وغیرہم بزرگوں کے اسمائے گرامی شمار کئے جاسکتے ہیں۔ مختصراً یہ کہ مسلمانوں کے سیاسی تنازعات اور مذہبی مناقشات کے درمیان ان بزرگوں کا وجود تقریباً دوسری صدی ہجری سے شروع ہوتا ہے اور ساتویں صدی ہجری پر آکر ختم ہوجاتا ہے۔

اس زمانے کے بعد پھر وہ زمانہ آتا ہے جسے علماء وفضلا اور مشائخ کا دَور کہتے ہیں۔ اس دَور میں سیاسی نظریات و عقاید مختلف مکاتیب فکر کی شکل اختیار کر گئے اور ان کی حیثیت سیاست سے زیادہ ایک مذہب کی ہوگئی۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ شدید مذہبی تعصب کی جلوہ گری بھی ہوئی، حتیٰ کہ ایک مکتب خیال کے لوگوں نے وسعت قلب و نظر سے محروم ہو کر دوسرے مکاتیب فکر کے لوگوں کو قتل کرنا اور انہیں ملحد و مشرک اور کافر بنانا شروع کر دیا۔ چنانچہ ایسے ہی زمانے میں ان بزرگوں نے جن کی تمام تر کوششیں صرف اسی مقصد کے لئے وقف تھیں کہ وہ گروہی انفرادیات سے بالاتر ہو کر نہایت فراخدلی اور وسعت قلبی کے ساتھ تمام مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع کریں اور ان میں آئے دن کے باہمی سرپھٹول کو روکیں صوفی کے نام پر شہرت رکھتے ہیں سطحی طور پر اگرچہ یہ لوگ محض گدڑی پہنے اور بوریے پر بیٹھنے والے دکھائی دیتے ہیں تاہم ان دلق پوش اور بوریہ نشینوں نے اسلام اور مسلمانوں کی جو خدمت اور حفاظت کی ہے وہ امراء تو کیا بڑے سے بڑے تاجداروں اور شہنشاہوں سے بھی نہیں ہوسکی۔ اللہ تعالیٰ کے یہ نیک بندے جو ہمیشہ اس کے حکموں پر چلتے اور اس کے رسولؐ کی سنت پر عمل کرتے رہے اللہ تعالیٰ کے

کے دوست اور اس کے پیارے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ایسے ہی لوگوں کو قرآن حکیم میں اولیاء اللہ کے نام سے موسوم کیا ہے۔

اگرچہ اب اولیا اللہ ہمارے درمیان جسمانی طور پر موجود نہیں، لیکن اپنے فرض کی بجا آوری، اللہ اور اللہ کے رسول کی اطاعت گذاری اور محبت کے طفیل وہ روحانی حیثیت سے ضرور موجود ہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ہمیں ان کی روحانی زندگی کا شعور نہیں۔ تاہم قرآن حکیم کی اس آیہ مبارکہ کے مطابق ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء ولکن لا تشعرون یعنی ان لوگوں کو جو اللہ کی راہ میں مارے جائیں مردہ نہ کہو، نہیں وہ زندہ ہیں مگر یہ کہ تم اس کا شعور نہیں رکھتے بلاشبہ ہم انہیں مردہ نہیں کہہ سکتے۔

اولیا اللہ کو آپ چاہے کسی عنوان سے یاد کریں خواہ کسی نام سے پکاریں اتنا ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے سیدھے راستے پر چلنے سے انہیں دین اور دنیا میں کوئی رنج ہے نہ غم۔ وہ ہر فکر سے آزاد اور ہر خیال سے پاک ہوتے ہیں۔ ان کا دل اللہ کی یاد سے ہر وقت آباد رہتا ہے انہیں کوئی ضرورت ستاتی ہے۔ نہ کسی شے کی حاجت پیش آتی ہے۔ ان کے نزدیک اللہ بس باقی ہوس۔

بلاشبہ جو اللہ کا ہو جائے اللہ تعالیٰ اس کا ہو جاتا ہے حتیٰ کہ اس کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ بقول مولانا روم کے الہامی ہو جاتا ہے جیسا کہ مولانا روم اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یوں فرماتے ہیں ؎

گفتہ او گفتہ اللہ بود — گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

کہنے کا مطلب یہ کہ اولیاء اللہ پر موت غالب نہیں آتی بلکہ وہ موت پر غلبہ پا لیتے ہیں یعنی جب تک دنیا قائم ہے، اولیاء اللہ کا نام ان کے اچھے کام کی بدولت زندہ رہے گا۔

ہمیں چاہیے کہ بلا امتیاز و تخصیص اولیاء اللہ کی سیرت کا مطالعہ کریں، ان کی زندگی کے شب و روز اور طریقہ کار پر ایک نگاہ ڈالیں اور سوچیں کہ جس دین کے ہم اور وہ نام لیوا ہیں کیا ہماری طرح وہ بھی ڈیڑھ اینٹ کی اپنی الگ الگ مسجد بنا کر بیٹھ گئے تھے اگر واقعہ یہ نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم سب مسلمان ایک ہی تسبیح کے دانے ہیں، ایک ہی امت کے افراد ہیں۔ ہمارا خدا ایک۔ رسول ایک، کتاب ایک اور ایمان ایک ہے تو ہمیں سوچنا چاہیے کہ ہم میں یہ گروہ بندی اور فرقہ سازی کیسی ہے ہم اختلافات کو ہوا دینے کی بجائے کیوں ٹوٹے ہوئے اسلامی رشتے کو جوڑنے کی کوشش نہیں کرتے اگرچہ اختلافات عہدِ صحابہ میں بھی موجود تھے۔ مثلاً۔

۱۔ اکثر صحابہ جسمانی معراج کے قائل تھے لیکن ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ کو اس سے انکار تھا وہ روحانی معراج کو مانتی تھیں۔

۲۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچیرے بھائی، سیدنا علی ابن ابی طالب کے منظورِ نظر اور مشیرِ خاص سیدنا عبداللہ بن عباس کہ امام المفسرین اور حبر الامت کہلاتے ہیں، رویائے الٰہی کا عقیدہ رکھتے تھے لیکن حضرت عائشہ رض کو اس سے اختلاف تھا۔

۳۔ حضرت عبداللہ بن عمر فاروق سماعِ موتیٰ کے قائل تھے لیکن اکثر صحابہ اس

سے انکار کرتے تھے۔

۴۔ حضرت ابوہریرہ کا عقیدہ تھا کہ عزیزوں کے نوحہ کرنے سے مرنے کو عذاب ہوتا ہے مگر حضرت عائشہ اس عقیدے کی مخالف تھیں

۵۔ حضرت ابوہریرہ کے نزدیک آگ پر پکی ہوئی شے کے استعمال سے وضو ٹوٹ جاتا ہے لیکن حضرت جابر کہتے تھے کہ اس سے وضو نہیں ٹوٹتا۔

۶۔ سیدنا علی، سیدنا عبداللہ بن عباس اور حضرت ابوہریرہ کہتے تھے کہ فجر کی نماز میں قنوت پڑھنا چاہیئے لیکن حضرت ابومالک اشجعی کہتے تھے کہ نہیں

الغرض یہ اور ایسے بہت سے اختلافات تھے جو خود صحابہ کے زمانے میں بھی موجود تھے مگر کیا ان کی بنیاد پر مسلمانوں میں کسی نے کسی کے خلاف کفر کا فتویٰ دیا۔ نمازیں اور مسجدیں الگ الگ کیں۔

ہر چند عقائد اور اعمال کے اعتبار سے بعض بعض صحابہ کا بھی آپس میں اختلاف رہا ہے لیکن وہ اس بنیاد پر کبھی ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہوتے اور نہ انہوں نے کبھی ایسا کوئی نام ہی اختیار کیا جس سے ان کے مکتب فکر کے باہمی تضاد کا امتیاز پیدا ہو بلکہ تمام حضرات صرف اسی ایک نام سے پکارے جاتے تھے جسے قرآنِ حکیم کے قول کے مطابق رسالت محمدیہ سے کئی سو برس پہلے سیدنا ابراہیم نے مسلمان کے نام سے موسوم کیا تھا۔ یہی سبب ہے کہ عہدِ اوّل میں سب ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھ لیا کرتے تھے لیکن جب اختلافات کی بات اعمال و عقائد سے چل کر حکومت و سیاست کے منصوبوں تک آگئی تب اس وقت سے مسلمانوں کی اجتماعی قوت میں ضعف آنا شروع ہو گیا۔

اور وحدتِ ملّی پارہ پارہ ہونے لگی۔

پہلا فرقہ

۳۷ ہجری میں جب حضرت علیؓ ابن ابی طالب نے حضرت معاویہ ابن ابی سفیان سے حکم کی بنیاد پر صلح کر لی اور حَکَم کا فیصلہ مان لیا تو ان کے ساتھیوں میں سے کئی ہزار آدمی ان سے الگ ہو گئے اور یہ نعرہ بلند کیا کہ لا طاعۃ غیر اللہ یعنی مذہب کے حق و باطل کا فیصلہ ثالث اور حکم کی رائے پر نہیں ہو سکتا چنانچہ مسلمانوں میں یہ وہ پہلا فرقہ ہے جو خالصتہً سیاسی وجوہ پر قائم ہوا مگر نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، اذان اور مسجد اس کی بھی وہی ایک ہی تھی جو سب کی تھی۔ صرف سیاسی اختلاف تھا اور بس!

تاریخ اسلام میں مسلمانوں کے اس سب سے پہلے گروہ کو، جو حضرت علی ابن ابی طالب کی رفاقت میں داخل ہو کر پھر ان کی اطاعت کے حلقے سے نکل گیا، خوارج کہا جاتا ہے۔ بعض لوگ اس فرقے کو معتزلہ بھی کہتے ہیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ خارجیوں کو حضرت علیؓ کی امامت کے سونپے ہوئے مناصب سے معزول کئے جانے کے سبب معتزلہ کہتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ توجیہہ بھی درست نہیں۔

معتزلہ کا گروہ خارجیوں کے بعد مسلمانوں کا دوسرا فرقہ ہے جو حضرت خواجہ حسن بصریؒ کے زمانے میں قائم ہوا۔ ہر چند معتزلہ کی تحریک کے محرکات بھی سیاسی ہیں تاہم ان کے مذہب کی بنیاد "عقلیت" پر قائم ہے۔ یعنی معتزلیوں

کے عقائد میں فلسفیانہ خیالات اور عقلی استدلال پیدا ہوا، اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ یہ مذہبی فرقہ بھی ہے اور سیاسی بھی۔ المختصر مسلمانوں میں سیاسی رائے کے اختلاف کے سبب الگ الگ فرقے اور ان کے جدا جدا نام پیدا ہونے کی ابتدا خوارج ہی سے ہوئی ورنہ اس سے پہلے اسلام میں کوئی فرقہ نہ تھا۔

خارجیوں کے نزدیک جو لوگ ان کے ہم خیال نہ تھے انہیں دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے۔ بعد کو "ہم خیالی" کے اس تنگ نظریہ اور متشدد جذبے نے کچھ ایسا زور پکڑا کہ ہر فریق اپنے مخالف گروہ کو باطل کا پیرو سمجھنے لگا۔ حتیٰ کہ ذاتی اغراض و مصالح کے تحت حریت، اخوت اور مساوات کے اسلامی اصول سہ گانہ کو بھلا دینے اور سیاسی اختلاف رائے میں تحمل اور بردباری کو راہ نہ دینے کا نتیجہ بالآخر یہ نکلا کہ بھائی بھائی کے خون کا پیاسا ہو گیا اور اس اصول کے خلاف جواز پیدا کرنے کے لئے کہ مسلمان کا مسلمان پر خون بہانا حرام ہے۔ ایک دوسرے کو پہلے ہی مرحلے پر کافر، زندیق اور ملحد بنا دیا گیا مدعا یہ کہ اسلام کے نزدیک دین اور دنیا دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے مگر جب سے دنیا پرستوں نے ۳۲ھ میں سیدنا عثمان غنی خلیفۃ المسلمین کو اور ۶۱ھ کے خونیں معرکہ کربلا میں سیدنا حسینؓ و دیگر افراد خاندانؑ کو شہید کر کے دین کو دنیا سے جدا کیا تب سے مسلمانوں میں باہمی جنگ و جدل اور قتل اور غارتگری کا سلسلہ قائم ہو گیا اور پھر یہ معاملہ صرف یہیں پر آکر ختم نہیں ہو گیا۔ بلکہ اس کے بعد بھی مسلمانوں میں سیاسی جھگڑوں کے باعث جنہیں مذہبی رنگ

دے دیا گیا۔ صدیوں تک برابر تلوار چلتی رہی اور یوں اس خونِ مسلم کی ارزانی ہوتی رہی جس کا بہانا خدا کے رسولؐ نے حرام قرار دیا ہے

وہ دین جس نے عالمگیر برادری، بھائی چارگی اور آپس میں برابری کا علم بلند کیا معرکہ کرب و بلا کے بعد نت نئی گروہ بندیوں اور فرقہ سازیوں کی بدولت اس کی حریت۔ اخوت اور مساوات کا پرچم خود مسلمانوں ہی کے ہاتھوں سرنگوں ہونے لگا۔ ایسے عالم میں جبکہ اقتدار کی جنگ لڑی جا رہی تھی اور مختلف خاندان اسلام کی حکومت پر اپنا اپنا حق جتا رہے تھے۔ حالانکہ یہ بات روزِ روشن کی طرح ان پر عیاں تھی کہ وہ حکومت جس کا قائم کرنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود بالذات نہ تھا بلکہ وہ آنحضرت کی تعلیمات کے نتیجے میں قائم ہوئی ہے اس لئے اس پر کسی فردِ واحد یا ایک خاندان کا نہیں بلکہ جمہور مسلمانوں کا حق ہے مگر اس کے باوجود وہ دنیا کی طلب میں مبتلا تھے اور باہم ایک دوسرے سے برسرپیکار تھے تو ایسے مخدوش حالات میں تسلیم و رضا کی خوگر اور صبر و استقامت کی پیکر ہستیوں کی آنکھیں مسلمانوں کی اصلاح پر لگ گئیں۔

یہ نکتہ بیں، نظر آفریں اور حیات پرور آنکھیں امت کے ان پاک اور نیک لوگوں کی آنکھیں تھیں جن کے دل و دماغ اور ہاتھ پیر کبھی خدا کے احکام کے خلاف نہیں چلے تھے اور نہ انہوں نے کسی مفاد کے لئے کوئی غلط راستہ ہی اختیار کیا تھا۔ وہ لوگ ذات رسالتمآب حضور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام رسانی کے طریقے کو جانتے تھے۔ انہیں بات

پہنچانے کا سلیقہ آتا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے ایمان کے جذبے سے سرشار ہو کر کسی امتیاز و تخصیص کو جائز نہ رکھتے ہوئے سیاسی جھگڑوں میں پڑے بغیر مسلمانوں کو آئے دن کی تفریق و انتشار سے بچانے اور غیر قوموں میں اسلام کا دین پھیلانے کا ایک عزم لے کر اٹھے۔ ان بزرگوں نے "خاموش تبلیغ" سے مقدور بھر کوشش کی کہ مسلمان گروہ بندی و فرقہ سازی کے چنگل سے نکل کر متحد ہو جائیں اور فروعی مسائل پر باہمی جنگ و جدل سے نجات پا جائیں۔ اسلامی تصوف کی تاریخ میں دین اسلام کی خدمت کرنے والے وہ پاک نفوس جو مجلس نبوی کے فیض یافتہ تھے جن کو بارگاہ نبوت سے علم و عمل کی سعادتیں نصیب ہوئیں۔ رسول خدا کے صحابی کہلائے پھر ان سے جن بزرگوں نے استفادہ کیا، انہیں تابعین کہا گیا۔ پھر جن علمائے امت نے تابعین سے فیض اٹھایا وہ تبع تابعین کہلائے۔ پھر ان بزرگوں سے آگے جو علمائے اسلام و بزرگانِ دین فیض یاب ہوئے وہ اولیا اللہ یعنی اللہ کے دوست کہلاتے ہیں بلاشبہ اللہ کے دوستوں نے مسلمانوں کے بد احوال کی اصلاح کے لئے جو طریقہ اختیار کیا وہ بالکل وہی تھا جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مصائب سے آلام سے پر مکی زندگی میں تطہیر فکر کا نام دیتے ہیں اور بلاشبہ یہ تطہیر فکر ہی کے عمل کا نتیجہ تھا کہ بہت ہی تھوڑی مدت میں سرزمین عرب کی بالکل کایا پلٹ گئی اور تعمیر فکر کا عمل شروع ہو گیا۔ حتیٰ کہ دیکھتے دیکھتے عرب کے گنوار ساری دنیا کے معمار بن گئے۔

اولیاء اللہ کے ضمن میں چلتے چلتے ذرا اس تفصیل پر بھی ایک نظر ڈالتے

جائیں تو اچھا ہے کہ پہلی صدی ہجری میں علمائے اسلام کے صرف دو طبقے تھے
ایک ارباب حدیث دوسرے اہلِ فقہ، بظاہر یہ دونوں اگرچہ الگ الگ طبقوں
کے نام دکھائی دیتے ہیں تاہم ان سے علما کے درمیان کسی ایسی علیحدگی کا کوئی
فرق اور امتیاز پیدا نہیں ہوا جس سے وحدتِ ملی کو نقصان پہنچے بلکہ یوں سمجھئے
کہ علما کے یہ دونوں طبقے جدا جدا فرائض منصبی یا طریق کار کی ذمہ داری کی ایک علامت
خیال کئے جاتے تھے۔ چنانچہ اسی خیال کو سامنے رکھتے ہوئے جناب اعمش نے
ایک مرتبہ یوں توضیح فرمائی کہ۔ یا معشر الفقهاء انتم الاطباء و نحن
الصیادلۃ (نشر العرف ص ۱۲۹) اے فقیہو تم طبیب ہو اور ہم (محدثین)
عطار ہیں۔ یعنی جناب اعمش نے کہا ہمارا کام اچھی اچھی دواؤں کا اکٹھا کرنا ہے
اور اے فقیہو تمہارا کام دوا کی جانچ پڑتال کرنا۔ مرض کا پتہ لگانا۔ مریض کے
مزاج اور اس کی بیماری کی نوعیت کے لحاظ سے دوا تجویز کرنا ہے۔ گویا اس
لحاظ سے ارباب حدیث اور ارباب فقہ دونوں کا مقصود اور فرض ایک
ہے۔ ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تیسری صدی ہجری میں بھی جب تک
تحریک تصوف نے ایک باقاعدہ اور علیحدہ مسلک کی صورت اختیار نہیں
کی تھی اور ابھی تصوف پر بھی جداگانہ علم کی حیثیت سے تصنیف و تالیف
کا سلسلہ نہیں چلا تھا۔ سیاست اور حکومت کے مخصوں سے علیحدہ رہ کر دینِ
اسلام کی خدمت کرنے والے ان تمام بزرگوں کو صرف عارف ہی کے نام
سے یاد کیا جاتا تھا اور محدثین کرام کی حیثیت ارباب حدیث کی بھی تھی اور
ارباب فقہ کی بھی۔ یعنی اب تک معاملہ صرف زہد و عبادت اور شریعت

کے مسائل تک محدود تھا لیکن تیسری صدی ہجری میں جب تصوف نے ایک علیحدہ اور باقاعدہ مسلک کی صورت اختیار کر لی اور اس کے کچھ قاعدے، کلیے، طریقے اور ضابطے لکھے گئے اور علم تصوف کی تصنیفات و تالیفات کا سلسلہ بھی چلا، جن میں طرح طرح کے خیالات اور عقیدے پیش کئے گئے تو اس زمانے سے تصوف کے ارباب میں بھی اختلافات پیدا ہونے لگے اور لوگوں نے اور مختلف خیالات و نظریات کو ایک جداگانہ مذہب کے طور پر نئے نئے معنی پہنانا شروع کر دیا اور ان کے لئے نئی نئی اصطلاحات بھی قائم ہوئیں۔ مختصراً یہ کہ اب علم کے دو شعبے یا دو پہلو قرار دے دیئے گئے۔ ایک ظاہری جس سے مراد تھی شریعت، دوسرے باطنی جس سے مراد تصوف کا علم تھا۔ پھر اس علم باطنی سے متعلق یہ بھی کہا گیا کہ اس علم کو سب سے پہلے رسول اللہ سے حضرت علی ابن ابی طالب نے حاصل کیا۔ پھر ان کے توسل سے یہ علم حضرت خواجہ حسن بصری کو ملا۔ پھر ان سے آگے دیگر اولیائے کرام نے حاصل کیا۔ غرض علم باطنی وہ علم ہے جو بزرگوں کے ذریعہ سینہ بہ سینہ آج تک محفوظ چلا آ رہا ہے۔ پھر مزید یہ بھی کہا گیا کہ علم ظاہری نام ہے شریعت کا اور علم باطنی عبارت ہے طریقت سے۔ شریعت سے انسان حقیقت کو پاتا ہے اور طریقت سے انسان کو معرفت حاصل ہوتی ہے۔ الغرض یہی ہے پہلا مرحلہ جہاں سے عالموں اور صوفیوں کے درمیان ایک مستقل نزاع کا آغاز ہوا ـــــ اور یہیں سے اسلام کی تبلیغ کے لئے زاہدوں اور عابدوں کا خاموش مسلک جس کے لئے اوّل اوّل تصوف کا لفظ استعمال

کیا گیا تھا نئے نئے قالب میں ڈھلنا شروع ہو گیا حتیٰ کہ پھر اس سے آگے شاخ در شاخ طرح طرح کے مکاتیب خیال الگ الگ عقیدے اور نظریے پیدا ہوتے چلے گئے۔ اگرچہ آگے چل کر علمائے اسلام اور صوفیائے کرام کے معرکے مستقل نزاع کی صورت اختیار کر گئے اور سید الطائفہ جنید بغدادی نے یہ کہہ کر کہ شریعت اور طریقت دو مختلف راہیں نہیں بلکہ ایک ہی تعلیم کے دو پہلو ہیں، اس تنازع کو ختم کرنے کی کوشش کی تاہم انہیں اس تنازعہ کو مٹانے کے لئے نام نہاد صوفیوں کی ناشائستہ باتوں کے سبب ناکامی ہوئی۔ بالخصوص تصوف کے سلسلے میں یہ بات بڑی المناک ہے کہ ابتدا میں جس تصوف کے ذریعے صوفی بزرگوں نے مسلمانوں کو فرقہ بازیوں سے نکالنے کی کوشش کی اور تسبیح کے بکھرے ہوئے دانوں کو ایک ہی لڑی میں پرونے کا سامان کیا۔ افسوس تصوف کا وہی مسلک نئے نئے معنی اور نیا قالب اختیار کر کے خود بھی تفرقہ سے محفوظ نہ رہ سکا۔

اگرچہ بعد کے زمانوں میں تصوف کا مسلک مختلف انتسابات کی وجہ سے علیحدہ علیحدہ سلسلوں میں تقسیم ہوتا گیا لیکن ان میں ایک بات ضرور قابلِ ذکر ہے وہ یہ کہ تمام سلسلے بالآخر حضرت علی ابن ابی طالب تک پہنچ کر ہی منتہی ہوتے ہیں اور ان سلسلوں کی بھی حیثیت بالکل اسی طرح یکساں ہے جس طرح فقہی مکاتیبِ فکر کی ہے مثلاً حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی جو علی الترتیب امام ابوحنیفہ۔ امام مالک۔ امام شافعی اور امام احمد بن حنبل سے نسبت رکھتے ہیں اب رہا یہ کہ فقہ کسے کہتے ہیں مختصراً یوں سمجھئے کہ عقلی دلائل سے دین کے مسائل پہ غور کر کے قرآن حکیم کی تعلیمات کے مطابق ان کا حل تلاش کرنا

فقہ کہلاتا ہے۔ فقہ کا علم حضور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کے بعد مدون ہوا۔ آپ کی تمام حیات مبارکہ میں صحابہ کرام نے صرف تیرہ سوالی آپ کی خدمت میں پیش کئے تھے۔ بقیہ سوالات زیادہ تر اس زمانے میں پیدا ہوئے کہ جب اسلامی فتوحات بڑھنے لگیں اور لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے لگے۔ اس زمانے میں صحابہ کرام کہ ذات رسالت مآب کے صحبت یافتہ اور آپ کی تعلیم کے فیض یاب تھے۔ اپنے اجتہاد بالتفقہ فی الدین سے فقہی مسائل کا حل تلاش کیا کرتے تھے۔ ان کے بعد تابعین پھر تبع تابعین اور ان کے بعد ارباب حدیث کا نام آتا ہے اور یہی وہ بزرگ ہیں جن کے زمانے میں فقہہ کے علم کی کتابوں کو باقاعدہ طور پر ترتیب دینے کی ضرورت پیش آئی۔

جن بزرگان دین و آئمہ کرام نے فقہ کی کتابیں لکھیں وہ اگرچہ انہیں کے ناموں سے ایک علیحدہ مکتبۂ فکر سے موسوم ہوئیں لیکن حقیقت میں ان کی حیثیت بھی کسی علیحدہ یا جداگانہ مذہب کی نہیں بلکہ قرآن و سنت کی روشنی میں ایک ہی راہ کی حیثیت رکھتی ہیں یعنی امام ابو حنیفہ کی فقہ کو حنفی، امام مالک کی فقہ کو مالکی امام محمد شافعی کی شافعی اور آخر میں امام احمد بن حنبل کی فقہ کو حنبلی کہا جاتا ہے۔ ان تمام بزرگوں نے دین سے ہٹ کر کوئی علیحدہ راہ اختیار نہیں کی بلکہ مسائل کے بارے میں انہوں نے یہ ایک حل تلاش کیا ہے مثلاً کسی شخص نے روزہ رکھا۔ بعد میں اسے یاد نہ رہا اور کچھ کھا پی لیا۔ جب اسے یاد آیا تب یہ سوال پیدا ہوا کہ بھول چوک میں کچھ کھا پی لینے سے روزہ رہتا

ہے کہ ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ مسئلہ گویا فقہی مسئلہ کہلاتا ہے۔ اب اسی پہ دیگر مسائل قیاس کر لئے جائیں۔ جن بزرگوں نے قرآن حکیم اور سنت نبوی کی روشنی میں صحابہ کرام کے طریقے پر غور و فکر اور اجتہاد کر کے مسائل کے حل تلاش کئے انہیں فقیہہ یا مجتہد کہتے ہیں۔ مقصد کہنے کا یہ ہے کہ عوام کی طرح خواص بھی کسی نہ کسی فقہی مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے تھے اور جس طرح ان فقہا میں کوئی حنفی تھے، کوئی شافعی، کوئی مالکی اور حنبلی۔ اسی طرح سے اولیائے کرام کے بھی تیسری صدی میں اور تیسری صدی ہجری کے بعد الگ الگ صوفیانہ سلسلے قائم ہوئے اور ان کا حال بھی وہی ہے جو فقہی مکاتیب فکر کا ہے یعنی صرف ناموں کی نسبت سے انتسابات مختلف ہیں لیکن روح سب کی ایک ہے۔

تصوف کے سلسلے یوں تو بہت سے ہوتے ہیں لیکن ہمارے ہاں پاک و ہند میں جو سلسلے پائے جاتے ہیں وہ صرف چار ہیں۔

۱۔ چشتی ۲۔ قادری ۳۔ نقشبندی ۴۔ سہروردی

یہ چاروں سلسلے جناب خواجہ حسن بصری ہی کے واسطے سے حضرت علی تک پہنچتے ہیں۔ حضرت خواجہ حسن بصری نہایت عالی رتبے اور اونچے مرتبے کے بزرگ تھے۔ ان کی طبیعت میں دنیا سے حد درجہ بے نیازی پائی جاتی تھی اور اس کا اندازہ کچھ اس تعریف سے بخوبی ہو سکتا ہے جو انہوں نے ایک فقیہہ یا مجتہد کے حق میں کی۔

خواجہ حسن بصری کے نزدیک فقیہہ یا مجتہد کی تعریف یہ ہے۔

۱۔ فقیہہ وہ ہے جو دنیا سے دل نہ لگائے یعنی اس کے نزدیک دنیا

مقصود بالذات نہ ہو۔

۲۔ آخرت کے امور میں رغبت رکھے۔

۳۔ دین میں کامل بصیرت حاصل ہو۔

۴۔ طاعات پر مداومت کرنے والا اور پرہیزگار ہو۔

۵۔ مسلمانوں کی بے آبروئی اور ان کی حق تلفی سے بچنے والا ہو۔

۶۔ اجتماعی مفاد اس کے سامنے رہے یعنی انفرادی یا شخصی مفاد پہ قومی و جماعتی مفاد کو ترجیح دیتا ہو۔

۷۔ مال کی طمع نہ ہو۔

آپ کے کچھ ایسے ہی اقوال اہلِ تصوف کے بارے میں بھی ہیں جنہیں ابن الجوزی نے اپنی کتاب صفوۃ الصفا میں نقل کیا ہے۔ جن میں سے ایک یہ ہے کہ جو شخص تواضع و انکسار سے پشمینہ پہنے گا (اونی۔ کپڑا۔ صوف) اللہ تعالیٰ اس کی آنکھ اور دل کے نور میں اضافہ کر دے گا اور جو شخص غرور اور نمائش کے لئے پہنے گا۔ اس کو سرکشوں کے ساتھ جہنم میں جھونک دے گا۔

نام نہاد مسلمانوں کے بارے میں فرماتے ہیں۔ کہتے ہیں سوادِ اعظم ہمارے ہی جیسا ہے۔ سو جہاں سب کو بخش دیا جائے گا ہم کو بھی بخش دیا جائے گا۔ اس طرح سے وہ نیک کام کرنے میں سستی سے کام لیتے ہیں اور دل میں خدا کے بارے میں من مانی آرزوئیں پکاتے رہتے ہیں۔ درحقیقت سب سے بڑا فاسق وہ ہے جو چھوٹے بڑے سبھی طرح کے گناہ کئے چلا جاتا ہے اور کہتا جاتا ہے کہ کوئی خطرے کی بات نہیں وہ بخشنے والا ہے۔ میرے لئے کوئی کھٹکا نہیں

وہ عنفوان بحث ہے گا۔

آخر میں خدا لگتی کلام کے طور پہ اتنی بات ضرور ذہن میں رکھ لینی چاہیئے کہ تصوف کی تحریک تیسری صدی ہجری سے بیشتر ایک باقاعدہ اور علیحدہ مسلک کے طور پہ قائم ہوئی نہ ابھی تصوف کے علم پہ جداگانہ اور علیحدہ تصنیفات کا سلسلہ ہی چلا۔ اس زمانے میں یوں سمجھئے کہ علمائے اسلام کے صرف دو طبقے تھے ۔ ایک ارباب حدیث، دوسرے اہلِ فقہ کا اب یہاں گفتگو علماء کے اس پہلے طبقے سے متعلق ہے جیسے آگے چل کر تصوف کو ایک علیحدہ مسلک کے طور پر قائم کرنے والوں نے قدیم صوفیا کہا ہے جن میں حضرت اویس قرنی اور حضرت خواجہ حسن بصری حضرت سفیان ثوری، رابعہ بصری اور دوسری صدی ہجری کے تمام بزرگانِ دین کے اسمائے گرامی سرفہرست ہیں اس لئے ہم یہاں صرف اہلِ تصوف ہی سے متعلق گفتگو کریں گے ۔

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ تیسری صدی ہجری سے پہلے تصوف کے علم پر تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری نہیں ہوا۔ سید الطائفہ جنید بغدادی المتوفی ۲۹۷ھ کا جب زمانہ آیا تو لکھنے لکھانے کا سلسلہ قائم ہوا۔ چنانچہ سب سے پہلے آپ ہی نے خاص تصوف کے موضوع پر ایک رسالہ القصد الی اللہ۔ عربی زبان میں لکھا جسے تصوف کے علم کی سب سے پہلی کتاب شمار کیا جاتا ہے ۔

تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں جب عجمی ذہن کے باعث تصوف میں نئے نئے مضامین پیدا ہوئے جس سے تصوف کی تحریک پہ بھی ایک

فلسفیانہ رنگ آ گیا حتیٰ کہ صوفیائے کرام کے اکثر خیالات اسلام کی تعلیمات کے برعکس نظر آنے لگے تو پانچویں صدی ہجری میں حضرت شیخ سید مخدوم علی ہجویریؒ نے تصوف کی تاریخ واضح کرنے اور صوفیوں کے خیالات کی اصلاح کرنے کے لئے اپنی مشہور عالم کتاب کشف المحجوب لکھی جیسے القصد الی اللہ عربی زبان میں تصوف کی پہلی کتاب ہے۔ ایسے ہی تصدیق کے علم پر کشف المحجوب فارسی زبان میں تصوف کی پہلی کتاب ہے اور خاص بات یہ ہے کہ کشف المحجوب تصوف کے موضوع پر اس وقت کی ایک مستند کتاب ہے جب شہاب الدین سہروردی کی عوارف المعارف اور ابن عربی کی فصوص الحکم کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ یہی سبب ہے کہ اس کتاب میں متاخرین صوفیا کا غلو اور نیم پختہ خیالات و معتقدات نہیں ملتے۔ کشف المحجوب میں اولیائے کرام کے خیالات پیش کئے گئے ہیں جن سے تصوف کے بارے میں ان غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے جو بے علم و بے عمل صوفیوں کی بدولت اس میں پیدا ہوئیں۔ مثلاً ابو یزید بسطامی کہتے ہیں۔ اگر تم کسی شخص کو دیکھو کہ وہ ہوا میں معلق ہو کر دو زانو بیٹھ جاتا ہے تو اس کی اس کرامت سے دھوکا نہ کھاؤ جب تک اس امر کو نہ دیکھ لو کہ حدود شریعت کی حفاظت میں اس کی کیا حالت ہے۔ (کشف المحجوب)

جو شخص قرآن حکیم کی تلاوت، شریعت کی حمایت، جماعت کا التزام جنازے کے ساتھ چلنا اور مریضوں کی عیادت کرنا چھوڑ دے اور نشان باطنی کا دعویٰ کرے، وہ جھوٹا ہے۔ بدعتی ہے۔ (کشف المحجوب)

شیخ سری سقطی کہتے ہیں۔

جو شخص ظاہر میں احکام خداوندی کی پیروی چھوڑ کر علم باطنی کا دعویٰ کرے وہ غلطی پر ہے۔

سید الطائفہ جنید بغدادی کہتے ہیں۔

جس شخص کو کتاب یاد نہیں۔ حدیث نہیں لکھتا۔ فقہ نہیں سیکھتا، اس کی پیروی نہ کرو، تصوف کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ صاف رکھنا۔ تصوف کی اصل یہ ہے کہ دنیا کی محبت سے علیحدہ ہو جائے

ابو بکر شفاف کہتے ہیں۔

جو شخص ظاہر میں امر و نہی کی حدود ضائع کرے وہ باطن میں مشاہدۂ قلبی سے محروم رہتا ہے۔

ابوالحسن نوری کہتے ہیں۔

جس شخص کو تم دیکھو کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسی حالت کا دعویٰ کرتا ہے جو اسے علم شریعت سے خارج کرے۔ تم اس کے پاس نہ جاؤ۔

ابو حفص کہتے ہیں۔

جس شخص نے اپنے حال احوال اور افعال و اعمال کو کتاب و سنت کے مطابق نہ تولا اور اپنے خطرات کو تہمت نہ لگائی اسے مردوں کے دفتر میں شمار نہ کرو (ماخوذ کشف المحجوب)

شیوخ صوفیہ کے ان اقوال کی روشنی میں یہ صاف معلوم ہو گیا کہ جن حضرات نے تصوف میں غیر اسلامی خیالات شامل کئے اور ان پر تصوف جدیدہ کی

کی بنیاد رکھی وہ صرف اور صرف اس بات کا نتیجہ ہے کہ ان لوگوں نے علم سے منہ موڑ کر فقط زہد و عبادت ہی کو جانِ تصوف سمجھ لیا۔ حالانکہ یہ بات کتاب و سنت اور قرآن و حدیث کے سراسر خلاف ہے۔

در اصل ارباب حدیث جنہیں صوفیائے قدیم کہتے ہیں۔ ان کے مقاصد بڑے پاکیزہ اور نیک تھے۔ لیکن جب تصنیفات و تالیفات کا سلسلہ چلا اور تصوف کا مسلک ایک مستقل فلسفہ بن گیا تو نام نہاد صوفیوں نے علم سے بے نیازی برتنا اور اس پر عبادت کو ترجیح دینا شروع کر دیا۔ حالانکہ بے علمی قدیم صوفیائے کرام کا مسلک ہی نہیں تھا۔ مثلاً ربیع بن خثیم کہتے ہیں، "پہلے علم حاصل کرو پھر گوشہ نشین ہو۔"

مطرف بن عبد اللہ کا قول ہے۔ کہ

"زائد علم زائد عبادت سے بہتر ہے۔"

یوسف ابن اسباطؒ نے فرمایا۔

"علم کا ایک باب حاصل کرنا ستّر غزوات سے بہتر ہے۔"

معافی بن عمران نے کہا۔

"ایک حدیث کا لکھنا مجھے تمام رات کی عبادت سے افضل ہے۔

علامہ ابن جوزی کہتے ہیں۔ میں نے ایک شخص حسین قزوینی کو دیکھا کہ وہ جامع منصور میں دن کو بہت ٹہلا کرتا تھا۔ میں نے سبب پوچھا تو کہا کہ میں اس بہانے سے نیند کو دور کرتا ہوں۔ میں نے کہا یہ تو شرع کے خلاف ہے اور عقل کے بھی خلاف ہے۔ کیا تمہیں یاد نہیں کہ حضور محمد رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اے شخص تیرے نفس کا بھی تجھ پر حق ہے تو نماز کے وقت نماز میں قیام کر اور سونے کے وقت سو بھی جا۔ چاہیئے کہ اعتدال کی راہ اختیار کرے۔

انس بن مالک نے کہا کہ رسول اللہ نے مسجد میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا کہ ایک رسی بندھی ہوئی لٹک رہی ہے۔ استفسار فرمایا یہ کیا شے ہے؟ عرض کیا یہ زینب کی رسی ہے کہ جب نماز پڑھتے پڑھتے تھکاوٹ ہوتی یا اونگھ آتی ہے تو یہ رسی تھام لیتی ہیں۔ رسول اللہ نے فرمایا کہ اسے کھول دو! پھر ارشاد فرمایا کہ تم جب تک چاق و چوبند رہو اس وقت تک نماز پڑھتے رہو لیکن جب تھکاوٹ یا سستی آئے تب رک جاؤ۔ جناب عائشہ کہتی ہیں کہ جب تم میں سے کوئی اونگھے تو سو رہے حتیٰ کہ اس کی نیند جاتی رہے اور پھر نماز پڑھے۔

درحقیقت صوفیائے متاخرین کا غیر اسلامی ذہن ان عجمی تصورات کی پیداوار ہے جن پر تصوف جدیدہ کے مصنفین نے اپنے خیالات کی بنیاد رکھی اور ان میں کتابیں لکھیں۔ مثلاً حارث محاسبی نے فقر و فاقہ اور وساوس و خطرات پر کتابیں تصنیف کیں جن کا نتیجہ یہ نکلا کہ بعض صوفیا بھوکے رہنے سے طرح طرح کے فاسد خیالات میں پڑ گئے۔ کسی نے اسے مشاہدہ حق سمجھ لیا کوئی کسی اچھی صورت کا تصور باندھ کے بیٹھ گیا۔ کسی نے حلول کا عقیدہ قائم کر لیا اور کوئی الحاد میں جا پڑا۔ ابو عبدالرحمٰن سلمی نے کتاب السنن لکھی جس میں صوفیا کی ان عجیب عجیب تفسیروں کا ذکر کیا گیا ہے جو انہوں نے قرآن حکیم کے بارے میں پیش کیں۔

یعنی جو لب پر آتا قرآن حکیم کے بارے میں بے تکلف کہتے چلے جاتے۔

ابو نصر سراج نے کتاب لمع الصوفیہ تصنیف کی اور اس میں ایسے صوفیانہ عقائد و خیالات پیش کئے جو قطعی مہمل اور لغو ہیں۔ ابو طالب مکی نے قوت القلوب لکھی جدّت طرازی میں یہ اس کتاب سے بھی چار قدم آگے ہے۔ لوگوں نے ان کے اس قول کو سامنے رکھتے ہوئے کہ مخلوق کے حق میں خالق سے زیادہ کوئی ضرر پہنچانے والے نہیں۔ ان کا وعظ سننا چھوڑ دیا۔ خطیب بغدادی کہتے ہیں کہ جس نے تصوف جدیدہ کی زبان دیکھنی ہو وہ قوت القلوب کو دیکھ لے۔ ابو نعیم اصفہانی نے کتاب الحلیہ تصنیف کی جس میں حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی ذوالنورین، حضرت علی ابن ابی طالب اور متعدد بڑے بڑے صحابہ کو صوفی کہا ہے، قاضی شریح، خواجہ حسن بصری، امام سفیان ثوری اور احمد بن حنبل کا ذکر اس انداز سے کیا ہے کہ گویا انہی حضرات سے تصوف کا سلسلہ آگے چلا ہے۔ اس کے علاوہ تصوف کے نام پر ایسے ایسے خیالات پیش کئے گئے ہیں جن کا تعلیمات اسلام سے دور کا بھی تعلق نہیں۔

علاوہ ازیں سلمی نے طبقات صوفیہ لکھی جس میں فضیل و ابراہیم بن ادہم اور معروف کرخی کا ذکر کیا ہے اور انہیں صوفی کہا ہے۔ یہ حضرات چونکہ زاہد تھے اس لئے تصوف کو زہد کی زیادتی کا مسلک قرار دیا۔ عبدالکریم بن ہوازن قشیری نے صوفیوں کے لئے کتاب الرسالہ تحریر کی جس میں وہ باتیں بیان کی ہیں جن کا کوئی سر ہے نہ پیر، بالکل بے معنی اور لایعنی۔ مثلاً فنا، بقا، قبض، بسط، وقت، حال، وجد، وجود، جمع و تفرقہ، صحو و سکر

ذوق و شوق، اثبات و تجلی، محاضرہ و مکاشفہ۔ لوائح، طوالع، لوامع مع تکوین و تمکین و شریعت اور حقیقت۔

مرقع۔ سماع۔ وجد۔ رقص اور تالیاں بجانا، یہ بھی نئے تصوف ہی کی اختراعات ہیں اور جن اولیائے کرام کو نئے صوفیوں نے زیب عنوان بنایا ہے وہ ان تمام باتوں کے یکسر خلاف تھے وہ شہرت نام و نمود سے پرہیز کرتے اور مکر و ریا اور فریب سے دُور بھاگتے تھے۔ وہ اپنے متبعین کو بھی ان چیزوں میں نہ پڑنے کی تلقین اور تاکید کرتے تھے جیساکہ مخدوم علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ کی تحریر سے ظاہر ہے کہ حقیقی صوفی کون ہے اور تصوف کیا ہے حضرت شیخ سید مخدوم علی ہجویری کے خیالات سے پورے طور پر واضح ہے جو انہوں نے سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی کے صوفیانہ اقوال کے طور پر اپنی کتاب کشف المحجوب میں نقل کیے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ۔

۱۔ صوفی زمین کی مانند ہے جس پر اچھے برے سب چلتے ہیں یا گھٹا کی طرح ہے جس کے سایہ سے ہر شئے کو فائدہ پہنچتا ہے۔ یا مثل بارش کے ہے جس سے تمام سیراب ہوتے ہیں۔

۲۔ جو صوفی ظاہر داری کا بڑا خیال رکھتا ہے سمجھ لو کہ وہ بدباطن ہے۔

۳۔ جو محبت کسی غرض سے پیدا ہو، وہ غرض کے پورا ہونے پر جاتی رہتی ہے۔

۴ - اصل محبت یہ ہے کہ محب کی صفات محبوب کی صفات میں اس طرح جذب ہوں کہ محبوب کی صفات کے سوا کچھ باقی نہ رہے۔

وما توفیقی الا باللہ
سعدی سنگروری
۹- دھنی رام روڈ، انارکلی
لاہور
۲۰ر فروری ۱۹۷۰ء

30 فروری ۱۹۷۰ء

نام و نسب

اویس بن عامر بن جزء بن مالک بن عمرو بن سعد بن عصوان بن قرن بن ردومان بن ناجیہ بن مراد بن مالک بن اومرادی مزحجی - مراد ایک قبیلے کا نام تھا جو یمن کے پاس کسی قصبے یا گاؤں میں رہتا تھا - مگر اس خیال سے متعلق کہ کیا وہ گاؤں جس میں قبیلہ مراد کے لوگ رہتے تھے اس کا نام قرن ہی تھا اور کیا گاؤں کا یہ نام پہلے ہی سے قرن چلا آتا تھا یا مرادی قبیلے کے کسی بزرگ نے جس کا نام قرن تھا اسے اپنے نام پر آباد کیا اور کیا مراد اور قرن دو الگ الگ قبیلے تھے یا مرادی قبیلے ہی کا نام قرن مشہور ہو گیا - ان مباحث کے بارے میں ہمارا قیاس یہ کہتا ہے کہ مرادی قبیلے ہی کے ایک شخص نے جس کا نام قرن مشہور ہو گیا اسے اپنے نام سے آباد کیا - پھر جب زمانہ جوں جوں گذرتا گیا اور مرادیوں کی آبادی اس گاؤں میں کثرت سے بڑھنے لگی تو آگے چل کر مرادیوں ہی کے ایک شخص قرن کے نام پہ گاؤں کی طرح قبیلے کا نام بھی مراد کی بجائے قرن ہی مشہور ہو گیا -

اب اگر یہ بات جیسا کہ ہم نے بیان کی ہے صحیح ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ حضرت اویس قرنی جس گاؤں میں پیدا ہوئے اس کا نام بھی قرن ہے اور جس قبیلے سے آپ کا نسلی تعلق ہے اس کا نام بھی قرن ہے - اگرچہ بوجہ چند

ولادت

ہمارے لئے آپ کی ولادت سے متعلق کسی تاریخ کا تعین کرنا تو مشکل ہے تاہم یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ قبل اسلام حضرت اویس قرنی یمن کے ایک گاؤں قرن میں پیدا ہوئے۔ قرن جس کے معنی عربی زبان میں سینگ، گیسو، تیس، اسی یا سو برس اور ایک عرصہ دراز کے ہیں لغت میں ایک قبیلے یا قوم کا نام بھی ہے۔ اس لئے اب یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ حضرت اویس قرنی کی نسبت ان کے قبیلے قرن کی طرف بھی ہو سکتی ہے اور گاؤں کی طرف بھی، اور عین ممکن ہے کہ آپ اسی نسبت سے قرنی کہلاتے ہوں۔

حضرت اویس قرنی کے والد محترم عامر ایک مزدور پیشہ بزرگ تھے۔ ابھی کمسن ہی تھے کہ ان کا سایہ اویس کے سر سے اٹھ گیا اور چونکہ وہ کوئی مالدار آدمی نہیں تھے جو اپنے پیچھے کوئی اثاثہ یا جائیداد چھوڑ کر چلے جاتے اس لئے پیٹ پالنے کے لئے حضرت اویس کو نہایت چھوٹی سی عمر ہی میں محنت مشقت اور سخت کوشی اختیار کرنی پڑی۔

حضرت اویس عام طور پر کھجوریں بیچتے اور مزدوری پر اونٹ چرانے کے لئے جنگل میں نکل جاتے تھے۔ دن بھر کی سخت محنت مشقت کے بعد جو کچھ اجرت میسر آتی اسے والدہ کی دیکھ بھال اور گھر کی دوسری تمام ضروری چیزوں پر خرچ کر دیتے۔ اور اگر گھر کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے بعد کچھ رقم بچ جاتی تو

اسے دوسرے ضرورتمندوں میں تقسیم کر دیتے۔ غرض ان کی زندگی کے یہی شب و روز تھے جن میں انہوں نے اسلام قبول کیا۔

حضرت اویس نے اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ظاہری آنکھوں سے دیکھنے کی سعادت نہیں پائی تاہم دل کی بصیرت کے طفیل وہ روحانی طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار سے ضرور مشرف ہوئے اور آنحضرتؐ کے نادیدہ عاشق صادق کہلائے۔ صحیح مسلم میں آتا ہے کہ آنحضرتؐ نے اپنے اس عاشق صادق کو خیر التابعین کے نام سے یاد فرمایا ہے اور حضرت عمرؓ کو ان کے بارے میں یوں اطلاع دی ہے کہ دیکھنا مراد قبیلے میں ایک شخص خیر التابعین ہونے کی حیثیت رکھتا ہے اس کا نام اویس ہے۔ وہ تمہارے پاس یمن کی امداد میں آئے گا۔ اس کے جسم پر برص کے داغ ہیں۔ اگرچہ اب تمام داغ اس کے جسم سے مٹ چکے ہیں۔ تاہم ایک درہم کے برابر ایک داغ ابھی تک اس کے جسم پر باقی ہے اور اس کی ماں بھی زندہ ہے جس کی وہ خدمت کرتا ہے۔ اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ جب اللہ کی قسم کھاتا ہے تو اسے پوری کرتا ہے۔ اگر تم اس کی دعائے مغفرت لے سکو تو ضرور لے لینا۔

حقیقی قومیت

قبیلہ مراد کس نسل سے تعلق رکھتا ہے اور حضرت اویس جو اسی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے کب پیدا ہوئے۔ واقعات کے تفصیلاً منضبط نہ ہونے

کے باعث قبیلہ مراد اور حضرت اویس قرنی کے حسب و نسب کے بارے میں تاریخی لحاظ سے حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ہاں اگر اسلام کے حوالے سے مسلمان قوم کا ایک فرد ہونا ان کی قومیت متصور کر لیا جائے تو قومیت کا یہ تصور قطعی حقیقی اور اسلامی ہوگا۔

غیر حقیقی قومیت

درحقیقت رنگ و نسل اور جغرافیائی حدود کی بنیادوں پر قومیت کا جو غیر حقیقی تصور آج انسانوں کے درمیان موجود ہے۔ اس کے وارث یا علم بردار دنیا میں وہی لوگ ہوئے ہیں جو کسی جھوٹی برتری کے واقعات کو اللہ تعالیٰ نے تاقیامت اہلِ دنیا کی عبرت آموزی کے لئے نمرود و ہامان اور شداد و فرعون وغیرہ ایسے ناموں سے محفوظ کر دیا ہے۔

اصل میں رنگ و نسل کی بنیاد پر دوسرے انسانوں پر تفوق اور برتری رکھنے کا احساس انسان کے جذبۂ خود پرستی کا نتیجہ ہے اور کیا تعجب کہ نمرود و فرعون ایسے جبّارانِ عالم نے جو اپنی ہستی کو بھلا کر اور دنیا کی چند روزہ حکومت اور سلطنت پا کر اپنے خدا ہونے کا دعویٰ کیا تھا ان میں خود پرستی ہی کے جذبات کارفرما تھے۔

فرعون مصر کے دریائے نیل میں غرق ہونے کے بعد رنگ و نسل کی بنیاد پر فخر و مباہات کی راہ پھر خود بنی اسرائیل نے اختیار کی جن میں پیغمبر پر پیغمبر آتے رہے اور وہ حقیقی و فطری قومیت کے وارث یا علم بردار ہوتے گئے۔ اجمالاً یہ کہ

بنی اسرائیل مدتوں سے فرعون مصر کی غلامی میں چلے آرہے تھے اور اس کی قوم (آل فرعون) کے ہاتھوں طرح طرح کے ہولناک مصائب اٹھا رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انہی میں سے ایک پیغمبر کو پیدا کیا جو انہیں فرعون مصر کی غلامی سے نجات دلائے۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے جنہیں پیدا ہوتے ہی فرعون کے ڈر سے پانی کی لہروں کے حوالے کر دیا گیا۔ خدا کی قدرت دیکھئے کہ جس بچے کو ختم کرنے کے لئے بنی اسرائیل کے ہزاروں نوزائیدہ بچے قتل کر دیئے گئے وہ بچہ خود فرعون مصر ہی کے گھر میں، فرعون کی خدا ترس بیوی بی بی آسیہ کے ہاتھوں معجزانہ طور پر پل پس کر جوان ہوا۔ اور موسیٰ نام پایا جس کے معنی پانی کی مانند کے ہیں۔ گویا خود حضرت موسیٰؑ کے نام ہی میں ان کی آپ بیتی کی داستان مخفی ہے۔ مگر افسوس بنی اسرائیل نے فرعون مصر کی غلامی سے نجات پا کر دنیا کی آزاد فضاؤں میں زندگی کے سانس لینے کا شکریہ الٰہی یوں ادا کیا کہ نسلی برتری کے جھوٹے دعوے اور سیادت کے گھمنڈ میں خدا کے رسولوں اور نبیوں کو آروں سے چیر نے پھاڑنے اور قتل کرنے لگے۔ اور انھوں نے یہاں تک دعویٰ کیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے چہیتے بیٹے اور اس کے رشتہ دار ہیں۔ اللہ نے تمام نسل انسانی پر صرف انہی کو سیادت بخشی ہے اور ان کی قومیت کو اس قدر بلند کیا ہے کہ ان پر کسی جرم یا غلطی کے باعث مواخذہ اور گرفت نہیں ہو سکتی۔ بنی اسرائیل اسی اولو العزم پیغمبر خدا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چھوٹے بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام کے پوتے اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے ہیں جس نے عراق میں دنیا کے سب سے بڑے بادشاہ اور غیر حقیقی قومیت کے علمبردار نمرود سے ٹکر لی تھی جو اپنے آپ کو خدا کہلواتا تھا کیونکہ دنیا میں اس

وقت سب سے زیادہ وہی طاقتور حکمران اور صاحب جبروت بادشاہ تھا۔

اسرائیل کا لفظ بقول یہودیوں کے حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب تھا اور انہی کے بقول اسرائیل کے معنی خدا سے کشتی لڑنے والے کے ہیں۔ یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ خدا نے دنیا میں بشکل انسان آکر حضرت یعقوب علیہ السلام سے کشتی لڑی تھی جس میں خدا ہار گیا اور حضرت یعقوب علیہ السلام جیت گئے۔ چنانچہ اسی من گھڑت اور فرضی واقعے کی بنا پر یہ لوگ اپنے آپ کو بنی اسرائیل کہتے ہیں اور ایک طویل مدت تک حکومت و سلطنت کے مالک رہنے کے باعث دنیا کی تمام قوموں پہ اپنے آپ کو سیادت کا مستحق اور ایک طویل مدت تک حکومت و سلطنت کے مالک رہنے کے باعث دنیا کی تمام قوموں پر اپنے آپ کو بلند و برتر سمجھتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ ان کی آج تک ساری دنیا سے لڑائی اور علیحدگی قائم ہے۔

بعض مورخین کا خیال ہے کہ بھارت کے برہمن جو اپنے آپ کو دنیا کی تمام قوموں پہ سلطانی اور بلند و برتر سمجھتے ہیں۔ اصل میں بنی اسرائیل ہی کی ایک شاخ کے افراد ہیں جیسا کہ بنی اسرائیل کو گمان ہے کہ وہ نسل کے اعتبار سے تمام انسانی نسلوں سے بلند ہیں۔ بالکل ایسا ہی گمان بھارت کے برہمن بھی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب تک دنیا قائم ہے کوئی نیچ قوم کا فرد برہمن نہیں بن سکتا اور برہمن جیسی اونچی ذات کا فرد کبھی نیچ قوم کا فرد نہیں ہو سکتا چاہے اس کی گفتار کیسی ہی اور کردار کیسا ہی ہو۔

اس کے برعکس اسلام نے رنگ و نسل کی بنیاد پہ قومیت اور عصبیت

اپنے یہاں کوئی جگہ نہیں دی اور حسب نسب کی بنیاد پر فخر و امتیاز کو مطلقاً کوئی پذیرائی نہیں بخشی بلکہ پیغمبر اسلام حضور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بالکل واشگاف لفظوں میں اعلان فرمایا۔ لیس منا من دعا الی عصبیۃ و لیس منا من قاتل علی عصبیۃ و لیس منا من مات علی عصبیۃ۔ یعنی جو شخص عصبیت (نسلی) کی دعوت دے اور وہ جو عصبیت پر جھگڑا کرے یا وہ جو عصبیت پر مارا جائے ۔۔ ہم میں سے نہیں یعنی وہ سب کچھ ہو سکتا ہے مگر مسلمان نہیں ہو سکتا۔

چنانچہ عصبیت نسلی ہی سے متعلق ایک واقعہ عہد رسالت میں بھی کچھ ایسا ہی پیش آیا تھا کہ ایک شخص جسے آنحضرت صلعم جہنمی قرار دیتے تھے ایک موقع پہ مسلمانوں کے دوش بدوش کھڑے ہو کر کفار کے خلاف لڑا حتی کہ لڑتے لڑتے بری طرح زخمی ہو کر گر گیا۔ صحابہ نے آنحضرت سے عرض کیا یارسول اللہؐ وہ شخص تو جنتی نکلا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ جاؤ تم پہلے اس بات کی تحقیق کر لو۔ چنانچہ صحابہ کرام زخمی کے پاس گئے اور کہا ہم تو تمہیں جہنمی سمجھتے تھے مگر تم نے جس طرح اسلام اور مسلمانوں کی خدمت اور حمایت کی ہے تم تو واقعی جنتی نکلے۔ زخمی شخص یہ بات سن کر قدرے مسکرایا اور کہا میں نہیں جانتا اسلام کا دین کیا ہے اور مسلمان قوم کون ہے میں تو فقط اتنا جانتا ہوں کہ میرے قبیلے کے لوگ تمہارے ساتھ مل کر فریق ثانی سے لڑ رہے تھے۔ عصبیت نسلی نے جو طبیعت کا خاصہ ہے اپنے قبیلے والوں کو دیکھ کر مجھے تمہارے دشمنوں کے خلاف ابھارا یہاں تک کہ میں بھی جنگ میں شریک ہو گیا اور لڑنے لگا۔

غرض یہ کہتے کہتے زخمی کا دم نکل گیا۔ القصہ مختصر وہ باوجود اسلام اور مسلمانوں کی حمایت میں لڑنے کے مسلمان قوم کا فرد اور اسلام کی توحید کا فرزند نہ کہلا سکا۔ کیونکہ اس کی کوشش کی تمام تر بنیاد عصبیت نسلی پر تھی۔ اب اسی پر ان لوگوں کے بارے میں قیاس کر لیجئے جو بظاہر خدا کے رسول سے نہایت قریبی رشتہ رکھتے تھے مگر اسلام سے محروم رہنے کے باعث مسلمان قوم کے فرد شمار نہیں کیئے جا سکتے۔ یا حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کو دیکھ لیجئے کہ باوجود ان کے صلبی ہونے کے ان کی آل یا اہل سے نکل گیا۔

غور کیجئے تو نسلی تعصب ہی کا یہ اثر تھا کہ بنی اسرائیل کو رسالت محمدیہ کے قبول کرنے کی سعادت نصیب نہ ہو سکی۔ بنی اسرائیل خیال کرتے تھے کہ تمام نسل انسانی کے صرف ہم ہی سادات ہیں۔ اگر نبوت و رسالت کا شرف کسی قوم کو مل سکتا ہے تو اونچی قوم کے افراد ہونے کی رعایت سے فقط بنی اسرائیل ہی اس کے مستحق ہیں۔

بنی اسرائیل دعویٰ کرتے ہیں کہ بنی قریش جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بڑے بیٹے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد ہونے کے مدعی ہیں۔ اگر وہ اپنے دعوے میں سچے بھی ہیں تب بھی انہیں یہ فضیلت و شرف حاصل نہیں ہو سکتا کہ ان میں کوئی رسول اور نبی پیدا ہو کیونکہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس بیٹے اسماعیلؑ اور اس بیوی ہاجرہؑ سے ہیں جنہیں حضرت ابراہیمؑ نے اپنی پہلی بیوی سارہ کی خوشنودی کے لئے گھر سے نکال دیا تھا (بلکہ نعوذ باللہ)۔ ان دونوں ماں بیٹے کو حضرت سارہ

سے جلن اور حسد کرنے کی پاداش میں عرب ایسے ریگستانی ملک میں بھوکا پیاسا اور تنہا چھوڑ دیا تھا۔

اگرچہ بنی اسرائیل کے یہ تمام دعوے جن کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے یقیناً سب کے سب غلط ہیں تاہم ان سے اتنا ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ بنی اسرائیل نے اپنے دعاوی کو سچا ثابت کرنے کی کوشش میں پیغمبروں کے کردار کی جو تصویر پیش کی ہے وہ بھی نسلی برتری اور تفوق ہی کے ایک ایسے مکروہ خیالات اور شرمناک جذبات کا نتیجہ ہے جس کے لئے بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کے اولوالعزم نبی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذات پر بہتان باندھنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔

اسلام کے نزدیک حقیقی قومیت یہ ہے کہ دنیا کے تمام لوگ جو متمدن و مہذب مخلوق ہونے کے باعث انسان اور ایک باپ حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹے ہونے کی مناسبت سے آدمی کہلاتے ہیں سب کے سب خدا کے بندے اور ایک ہی کنبے کے افراد شمار ہوتے ہیں چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ یاایھا الناس انا خلقنا کم من ذکر و انثی وجعلنا کم شعوبا و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقکم ان اللہ علیم خبیر ○ اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے۔ پھر ہم نے تمہارے کنبے اور قبیلے بنا دیئے تاکہ ایک دوسرے کو پہچان سکو بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سے معزز (پسندیدہ) وہ ہے جو اس سے ڈرتا ہے بے شک اللہ علیم و خبیر ہے۔

اللہ تعالیٰ پھر اسی بات کو قرآن حکیم میں ایک جگہ یوں بیان فرماتا

فرماتا ہے کہ تمام بنی آدم صرف ایک ہی قوم ہیں - کان الناس أمة واحدة فبعث الله النبین مبشرین و منذرین و انزل معهم الکتب بالحق ٥ تمام لوگ (چاہے وہ مشرق میں رہتے ہوں یا مغرب میں، شمال میں رہتے ہوں یا جنوب میں پہلے پہل سبھی ایک ہی قوم تھے - اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لئے خوشخبری دینے اور ڈرانے والے نبیوں کو بھیجا - ان کے ذریعے سچی کتاب نازل کی - آیت سے ظاہر ہے کہ ابتدا میں تمام بنی آدم ایک ہی امت کہلاتے تھے - پھر اس کے بعد ان میں اختلافات پیدا ہونے لگے - یعنی اولاً ایک باپ کے رشتے سے دنیا کے تمام لوگ ایک ہی قوم تھے، صرف جغرافیائی حدود اور آب و ہوا کے اثر نے ان کے رنگ و نسل اور زبان کے لب ولہجے پر اثر ڈالا ہے جس کا مشاہدہ ہم آج بھی کر رہے ہیں - ثانیاً یہ کہ اختلافات مذاہب کی وجہ سے اگرچہ وہ اب ایک علیحدہ علیحدہ قوم کے افراد خیال کئے جاتے ہیں - تاہم اس جہت سے کہ تمام لوگ حضرت آدمؑ کے بیٹے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان سب میں الگ الگ اوقات میں اپنے رسولوں اور نبیوں کو بھیجا ہے - اب یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ اسلام کے ماننے والے ان لوگوں کو جو غیر مسلم ہیں اپنے سے کمتر یا حقیر خیال کریں اور اس کے مقابلے میں اپنے آپ کو برتر اور معزز سمجھیں -

درحقیقت اسلام کی تمام تر تعلیمات توحید پر مبنی ہیں اور یہ توحید ہی کا تقاضا ہے کہ اسلام کے ماننے والے دنیا کے تمام انسانوں کو ایک ہی خدائی کنبے کے افراد خیال کریں اور تقوے کی بنیاد کے سوا ہرگز کسی کو کسی پر اعلیٰ و برتر نہ

سمجھیں۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ ارشاد فرماتا ہے۔ قولوا امنا باللّٰہ وما انزل الی ابراھیم واسمٰعیل واسحٰق و یعقوب والاسباط وما اوتی موسیٰ وعیسیٰ وما اوتی النبیون من ربھم لا نفرق بین احد منھم ونحن لہ مسلمون۔ یعنی لوگوں سے کہدیجیے ہم اللہ کو مانتے ہیں اور جو خدا نے اپنے رسول پر اتارا ہے اسے بھی تسلیم کرتے ہیں اور اسے بھی مانتے ہیں جو حضرت عیسیٰؑ اور حضرت موسیٰؑ کو دیا گیا ہے۔ ہم تو ان سب چیزوں کو تسلیم کرتے ہیں جو خدا نے اپنے رسولوں کو دی ہیں اور ہم تو خدا کے بھیجے ہوئے لوگوں میں فرق ہی محسوس نہیں کرتے کیونکہ ہم خدا کے ماننے والے یعنی مسلمان ہیں۔

ملاقات رسولؐ کا اشتیاق

روایات میں آتا ہے کہ ظہور اسلام کے بعد جب نبوت کی تعلیمات پھیلنے لگیں تو حضرت اویسؓ قرنی نے اسلام کے اثر سے آپ سے آپ اسلام قبول کر لیا اور اب ان کا روز بروز اشتیاق بڑھنے لگا کہ وہ موقع پائیں تو مدینے پہنچ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار سے مشرف ہوں وہ بالآخر ایک روز جذبات کے جوش میں آکر مدینے پہنچ گئے۔

لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی پہلے ہی سے اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے کہہ رکھا تھا کہ ایک پارسا شخص ہمارے یہاں آنے

والا ہے تم اس کا خیال رکھنا اور خاطر مدارات سے پیش آنا۔ یہاں تک کہ میں اپنے گھر پہنچ جاؤں اور اگر وہ کچھ زیادہ دیر تک انتظار نہ کر سکے تو اس کی صورت ہی ذہن میں رکھ لینا ہر چند آنحضرت ؐ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کو اویس قرنی سے متعلق قطعی مطلع کر دیا تھا مگر سوئے اتفاق کہئے کہ اویس قرنی بصد اشتیاق مدینے میں آئے بھی لیکن آنحضرت ؐ کے دیدار مبارک کی حسرت دل کی دل ہی میں لے کر چلے گئے اور مطلقاً اپنی خاطر مدارت نہ کرائی۔ راوی بیان کرتا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سفر سے واپس تشریف لائے اور آپ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ سے دریافت فرمایا تو انہوں نے عرض کیا کہ ہاں ایک شخص آیا تھا جو یمن کا مسافر اور دیکھنے میں چرواہا لگتا تھا۔ مگر وہ آپ کو گھر میں نہ پا کر اُلٹے پاؤں واپس چلا گیا۔ آپ کی تشریف آوری کا انتظار نہ کر سکا۔

فضیلت

حضرت خواجہ فریدالدین عطار اپنی کتاب تذکرۃ الاولیاء میں لکھتے ہیں کہ حضرت خواجہ اویس ؒ قرنی کا شمار تابعین میں ہوتا ہے لہذا یہ بلاشبہ درست ہے اس لئے کہ جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت با برکت میں بیٹھے اور آپ سے اکتساب کیا۔ صحابہ کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ پھر جو لوگ صحابہ کرام سے ملے ان سے ملاقات کا شرف حاصل کیا ہے۔ انہیں تابعین کہا جاتا ہے۔ پھر جن بزرگوں نے تابعین کی صحبت پائی۔ اُن سے استفادہ

کیا۔ انہیں تبع تابعین کہا جاتا ہے اور پھر ان حضرات کے بعد ان بزرگوں کا درجہ آتا ہے جنہیں اولیائے کرام کہتے ہیں۔

اگرچہ حضرت اویس قرنی کو آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہونے اور آپ کا رخ مبارک دیکھنے کا شرف حاصل نہ ہو سکا۔ تاہم اس کے باوجود وہ آنحضرت صلعم سے بے پناہ محبت رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ ساری دنیا میں آنحضرتؐ کے نادیدنی عاشق مشہور ہوئے اور یہی سبب ہے کہ وہ بھی آنحضرتؐ کی خاص توجہ سے کبھی محروم نہیں ہو پائے روایات میں آتا ہے کہ آنحضرتؐ یمن کی طرف منہ کر کے اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میں یمن کی طرف سے نسیم رحمت آتی ہوئی پاتا ہوں۔

آنحضرت صلعم سے ملاقات کا شرف حاصل نہ ہونے کا سبب تذکرہ نویسوں نے یہ بیان کیا ہے کہ حضرت اویس قرنی کی والدہ جو ایک مومن عورت تھیں بہت ضعیف تھیں۔ حضرت اویس قرنی جانور چراتے اور اس کے بدلے میں جو اجرت، معاوضہ ملتا اس سے اپنی ماں کی خدمت کرتے اور ان کی زندگی کی ضروریات کا خرچ اٹھاتے۔ وہ ایک مرتبہ آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہونے کے اشتیاق سے مدینے آئے اتفاق سے آنحضرتؐ کسی غزوہ میں تھے وہ آخر آنحضرتؐ کو مدینے میں نہ پا کر اس مجبوری کے باعث بغیر انتظار کئے واپس چلے گئے کہ وہ اپنی کمزور اور ضعیف ماں کو تھوڑی دیر کے لئے جو تنہا چھوڑ آئے ہیں وہ شاید تکلیف میں ہوں گی اور اب ان کے لئے مزید انتظار کرنا دشوار ہو گا۔

روایات میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن صحابہ سے فرمایا کہ عمرؓ و علیؓ سے اویس قرنیؓ کی ضرور ملاقات ہوگی۔ اب یہ روایت صحیح ہے کہ غلط اس سے متعلق تو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ مگر واقعات سے ضرور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت عمرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد اویس قرنی سے ملنے گئے تھے اور ان سے ملاقات بھی ہوئی بعض راویوں نے بیان کیا ہے کہ آنحضرتؐ نے اپنے صحابہ سے فرمایا تھا کہ اویس قرنیؓ کے بائیں ہاتھ اور پہلو پر درم کے برابر ایک سفید داغ ہے لیکن وہ برص کا داغ نہیں۔ چنانچہ جب حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ اُن سے جا کر ملے تو انہوں نے سچ مچ وہ داغ موجود پایا۔

کہتے ہیں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کا وقت آیا تو صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ کا مرقع کسے دیا جائے آنحضرتؐ نے فرمایا اویس قرنی کو۔ چنانچہ جب حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت کے زمانے میں حضرت عمرؓ کے حضرت علیؓ کوفے تشریف لائے تو انہوں نے لوگوں سے دریافت کیا کہ کیا تم اویسؓ قرنی کو جانتے ہو اور کیا ان کا پتہ نہیں بتا سکتے ہو۔ اس پر ایک شخص نے عرض کیا کہ میں نے ایک شخص کو دیکھا ہے جو شتر بانی کرتا ہے اگرچہ میں اس کے نام سے واقف نہیں تاہم اتنا ضرور جانتا ہوں کہ وہ بالکل ایک درویش صفت انسان ہے اور فلاں جگہ پر رہتا ہے ہو سکتا ہے اویس قرنی اسی شخص کا نام ہو۔ مختصراً یہ کہ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ جب اس شخص کے بتائے ہوئے پتہ کے مطابق وہاں پہنچے تو آپ حضرات نے دیکھا کہ ایک شخص نماز

پڑھ رہا ہے۔ جب وہ فارغ ہوا تو اس کے قریب گئے اور سنت نبوی کے مطابق سلام کر کے پوچھا کہ آپ بتا سکیں گے آپ کا نام کیا ہے۔ جواب دیا عبداللہ۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ عبداللہ یعنی اللہ کا بندہ تو اے صاحب اللہ کے بندے تو ہم سب ہیں۔ آپ اپنا خاص، نام بتائیں۔ کہا اویس؛ تب حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا کہ اگر زحمت نہ ہو تو ذرا اپنا دایاں ہاتھ دکھائیں۔ اس پر اویسؓ نے ہاتھ بڑھا دیا۔ حضرت عمرؓ نے دیکھا تو اس پر ہو بہو بالکل وہی نشانی موجود تھی جو آنحضرتؐ نے ان کے ہاتھ کے بارے میں ارشاد فرمائی تھی۔ اب حضرت عمرؓ سے نہ رہا گیا، بے اختیار فرمایا۔ اے اویس آپ کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے جو علامت بیان کی تھی وہ آپ کی ذات میں قطعی موجود ہے۔ لیجئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا یہ مرقع (یعنی لباس) آپ شوق سے پہن لیجے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے آپ ہی کے حوالے کر دینے کی وصیت فرمائی تھی۔ یہ کہہ کر حضرت عمرؓ نے وہ مرقع انہیں سونپ دیا اور انہوں نے اسے ایک عطیہ الٰہی سمجھ کر زیب تن کیا اور اس بیش بہا بخشش پر خدا کا شکریہ ادا کرنے کے لیئے شکرانے کے نفل پڑھے۔

والہیت

یہ روایت بے حد مشہور ہے کہ جب اُحد کی جنگ میں جو کفارِ مکہ نے جنگِ بدر میں اپنی پہلی شکست کا بدلہ لینے کے لیئے برپا کی تھی

آنحضرتؐ کے بعض مقرر کردہ مجاہدوں کی ایک نادانستہ غلطی سے مسلمانوں کو شکست ہوگئی اور افراتفری یہاں تک پھیلی کہ خود آنحضرت بھی شدید زخمی ہوگئے اور آپ کے ایک یا دو دانت شہید ہوگئے تو حضرت اویس قرنی نے اس واقعہ کی اطلاع پاتے ہی شدتِ غم سے اپنے تمام دانت منہ سے نکال باہر کئے۔

تذکرۃ الاولیاء میں لکھا ہے کہ حضرات عمرؓ و علیؓ نے جب حضرت اویس قرنی سے یہ سوال کیا کہ ذرا یہ تو بتایئے کہ اُحد کی جنگ میں جب آنحضرتؐ کے دنداں مبارک شہید ہوئے بھلا وہ کونسے تھے، اوپر کے تھے یا نیچے کے، اس پر حضرت اویسؓ قرنی نے اپنا سارا منہ کھول دیا۔ ان حضرات نے دیکھا کہ حضرت اویسؓ قرنی کے منہ میں ایک بھی دانت سلامت نہیں، سب کے سب ٹوٹے ہوئے ہیں۔ اویسؓ قرنی بولے دراصل مجھے اس بات کا صحیح اندازہ نہ ہوسکا۔ کہ آنحضرتؐ کا کونسا دانت شہید ہوا۔ اس لئے میں نے اشتباہ کو مٹانے اور شک و شبہ کو دور کرنے کے لئے اپنے سارے ہی دانت توڑ ڈالے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قدر والہانہ محبت، عقیدت اور عشق دیکھ کر ان حضرات کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے اور طبیعت پر سخت رقت طاری ہوگئی، اور کہا ایسے شک ادب کا منصب ہی کچھ اور شے ہے۔

حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کی ملاقات کا واقعہ ہم اگر تاریخی اسناد سے معلوم کرنا چاہیں تو صرف اتنا پتہ چلے گا کہ یہ زمانہ عہدِ فاروقی کا تھا

اور اویس قرنی سے ملاقات کرنے کے لئے غالباً حضرت علیؓ بھی حضرت عمرؓ ہی کے ساتھ گئے تھے۔

حضرت عمرؓ سے ملاقات

تاریخی ماحصل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اویسؓ قرنیؓ سے متعلق جو نشانی حضرت عمر فاروقؓ کو بتائی تھی آپ اسے اپنے ذہن میں رکھ کر اویسؓ قرنی کی تلاش میں برابر لگے رہے۔ حتیٰ کہ جب آپ کی خلافت کا زمانہ آیا اور یمن سے فوجی مدد آئی تو آپ مسلسل تلاش و جستجو کرتے کرتے اویسؓ قرنی تک جا پہنچے اور ان سے پوچھا کہ کیا تم اویس بن عامر ہو؟ انہوں نے جواب میں کہا، ہاں! میں ہی اویس بن عامر ہوں۔ پھر حضرت عمر فاروقؓ نے دوسرا سوال یہ کیا کہ اے اویس، کیا تمہارے کوئی ماں ہے؟ انہوں نے جواباً کہا ماں ہے میں دن رات ان کی خدمت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

الغرض چند ابتدائی معلومات حاصل کرنے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ارشاد کی ہوئی چند علامات کے معلوم کرنے کے بعد حضرت عمر فاروقؓ نے ان سے فرمایا۔ اے اویس! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا ہے کہ تمہارے پاس یمن کے لوگوں کی مدد کے ساتھ قبیلہ مراد اور قرن کے گاؤں کا ایک شخص اویس بن عامر بھی آئے گا جس کے بدن پر برص (پھلبہری) کا مرض رہا ہوگا لیکن برص کے داغ ان کے سب مٹ چکے ہوں گے صرف

ایک درہم کے برابر داغ ضرور ہوگا - اس کے ایک ماں ہے جس کے ساتھ وہ نیکی کرتا ہے اور اس کی خوبی ایک یہ بھی ہے کہ جب وہ اللہ کی قسم کھاتا ہے تو اسے پورا کرتا ہے اگر تم اس سے دعائے مغفرت لے سکو تو ضرور لینا! پس اب میرے لئے دعائے مغفرت کرو - اویس رضؓ قرنی نے یہ سن کر حضرت عمر فاروق رضؓ کے لئے دعائے مغفرت کی -

اس کے بعد حضرت عمرؓ نے اویس رضؓ قرنی سے پوچھا کہو اب کدھر کا ارادہ ہے - انہوں نے کہا کوفہ کا - اس پر حضرت عمر رضؓ فاروق نے فرمایا - میں تمہارے لئے کوفہ کے گورنر کو لکھے دیتا ہوں کہ وہ تمہیں ہر ممکن سہولت بہم پہنچائے - اویس رضؓ قرنی بولے، نہیں مجھے اس کی ضرورت نہیں - مجھے عام لوگوں ہی کے زمرہ میں رہنا زیادہ پسند ہے - چنانچہ حضرت اویسؓ قرنی اس ملاقات کے بعد اپنا مختصر سامان اونٹنی اچھے نے کا لے کر کوفے چلے گئے -

اس واقعہ کے کوئی دو ایک سال گزرنے کے بعد کوفہ کا ایک معزز آدمی حج کے لئے مکے آیا اور پھر یہاں سے جب مدینے گیا تو اس سے حضرت عمر فاروق رضؓ نے حضرت اویسؓ قرنی کی خیر و عافیت پوچھی اور حالات دریافت کئے - اس نے کہا اویس قرنی ایک بوسیدہ جھونپڑے میں رہتے ہیں اور تنگدستی میں زندگی کے دن بسر کرتے ہیں - حضرت عمر رضؓ نے اس شخص سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کی اور فرمایا کہ اب تم واپس جا کر اویس قرنی سے ملنا اور اپنے لئے دعائے مغفرت ضرور حاصل کرنا - یہ شخص

حضرت اویس رضؓ قرنی کی خدمت میں پہنچا اور اُن سے مغفرت کی دعا کا طالب ہوا اویس رضؓ نے کہا تم خود ایک مبارک سفر سے واپس آرہے ہو اس لئے پہلے تم خود میرے لئے دعا کرو۔ پھر انہوں نے پوچھا کیا تم حضرت عمرؓ سے ملے تھے، جواب دیا کہ ہاں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ اس گفتگو کے بعد حضرت اویسؓ قرنی نے ہاتھ اٹھا کر اس شخص کے لئے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا کی

شہرت سے اجتناب

جیسا کہ روایات سے واضح ہے کہ حضرت اویسؓ قرنی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنے کا موقع نہیں ملا بلکہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کے دیکھنے والوں کو دیکھا ہے۔ اس لئے آپ کا درجہ صحابہ کے بجائے تابعین میں شمار ہوتا ہے۔ اگرچہ تابعین کی صف میں بھی آپ کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ تاہم جملہ کمالات و فضائل کے باوجود بھی آپ کا نام نامی اور اسم سامی اپنے زمانے کے علمائے اسلام میں کہیں سننے میں نہیں آیا۔ حتیٰ کہ اُن سے کوئی روایت تک مروی نہیں لیکن اس سے یہ خیال کرنا صحیح نہیں کہ وہ علوم ظاہری میں ایک جامع شخصیت کے حامل نہ تھے۔ بات اتنی تھی کہ انہیں ایک تو ریاضیات و مجاہدات اور تزکیہ روح سے ہی اتنی فرصت نہیں تھی کہ وہ گوشہ تنہائی سے نکل کر لوگوں کے سامنے آتے اور درس اور تدریس کے لئے مسندِ علم پر بیٹھتے، دوسرے انہیں طبعاً شہرت اور نام و نمود

ہی سے کچھ ایسی نفرت رہی کہ انہوں نے اپنے لئے ایک محدث ، فقیہہ اور مفتی کے منصب و مقام کو کبھی پسند نہیں کیا

اور یہ بات ایک مرتبہ خود حضرت اویس نے اپنے ہی منہ سے کہی کہ مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اسی طرح پہنچی ہیں جس طرح تمہیں پہنچی ہیں لیکن میں اپنے اوپر ان کا دروازہ کھول کر یہ پسند نہیں کرتا کہ لوگ مجھے مفتی ، محدث یا قاضی خیال کرنے لگیں ۔ مجھے خود اپنے تزکیہ نفس کے بہت سے کام ہیں ۔ بھلا میرے پاس ایسی باتوں کے لئے کہاں وقت ۔ مجھے شہرت سے نفرت اور عزلت بے حد پسند ہے ۔ میرے نزدیک مسند علم پر بیٹھنا ، شہرت میں پڑنے اور عزلت سے محروم رہنے کا باعث ہے ۔

تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ حضرت اویسؓ قرنی شاید تمام عمر گمنامی ہی کے گوشے میں پڑے رہتے اگر ان سے حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کی ملاقات نہ ہوتی ۔ دنیائے اسلام میں حضرت اویسؓ قرنی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک نادیدنی عاشق کی حیثیت سے متعارف کرانے کا فقط یہی ایک واقعہ باعث ہوا ہے اور اسی واقعہ سے آپ مشہور ہوئے ۔ ورنہ آپ کو اس سے پہلے صرف ایک ہی بزرگ جانتے تھے جن کا نام ہرم بن حبان رحمۃ اللہ بیان کیا جاتا ہے ۔

ہرم بن حبان رحمتہ اللہ کہتے ہیں کہ جب حضرات عمرؓ و علیؓ کی ملاقات کے بعد حضرت اویس قرنی کی شخصیت کھل کر لوگوں کے سامنے آئی تو میرے دل میں بھی آپ کے دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا چنانچہ میں نے کوفے پہنچ کر

آپ کو تلاش کیا۔ اتفاق سے ایک روز دیکھا کہ آپ دریائے فرات کے کنارے وضو کر رہے ہیں۔ میں نے اُن کے بارے میں جو باتیں سُن رکھی تھیں۔ ان کی مدد سے انہیں پہچان لیا اور قریب جاکر سلام کیا اور چاہا کہ میں ان کا ہاتھ پکڑ لوں مگر انہوں نے ہاتھ گھسیٹ لیا اور کہا حرم بن حیان خدا تمہیں زندگی بخشے تم یہاں کس طرح آنکلے انہوں نے جواباً کہا آپ نے تو مجھے اس سے پہلے کبھی دیکھا ہی نہیں۔ پھر آپ نے میرا نام کیونکر معلوم کر لیا۔ جواب دیا وہ جس کے علم سے کائنات کی کوئی شے باہر نہیں مجھے اُس نے تمہارے نام سے آگاہ کیا ہے۔ میری روح نے تمہاری روح کو پہچان لیا ہے۔ کیونکہ ایمان والوں کی روحیں ایمان والوں سے واقف ہوتی ہیں۔

ہرم بن حیانؒ کہتے ہیں کہ میں نے اب اُن سے مزید تفحص کی اور کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی روایت بیان فرمائیں اس پر وہ بولے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی نہیں دیکھا اور نہ کبھی ان کی باتیں سنیں۔ پھر میں نے عرض کیا کہ قرآن حکیم ہی کی کوئی آیت پڑھیں۔ اس پر انہوں نے وَمَا خلقت الجن والانس الا لیعبدون پڑھی۔ پھر اس کے بعد انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ اے ابن حیان تم یہاں کس لئے آئے ہو۔ عرض کیا کہ آپ سے ملنے تاکہ آپ سے مل کر مجھے سکون و راحت نصیب ہو۔ حضرت اویس قرنی بولے جس کسی نے خدا کو پہچان لیا میں نہیں سمجھتا کہ اسے راحت نصیب نہ ہو۔ سکون و راحت تو اللہ کے ذکر سے میسر آتی ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ جسے اللہ کی معرفت میسر آجائے وہ ماسوا سے محبت اختیار کرے۔

ھرم نے کہا کہ کچھ وصیت بیان فرمائیں۔ انہوں نے جواباً فرمایا کہ جب سو جاؤ تو موت کو اپنے سرہانے خیال کرو اور جب جاگو تو اسے اپنے سامنے سمجھو۔ گناہ کو حقیر خیال نہ کرو۔ حقیر سمجھ گئے تو مارے جاؤ گے

ھرم نے پھر عرض کیا آپ مجھے کہاں ٹھہرنے کا حکم دیتے ہیں۔ کہا شام چلے جاؤ۔ ھرم پھر بولے کہ وہاں گزر بسر کی کیا صورت ہوگی۔ حضرت اویس رضی قرنی نے جواب میں فرمایا کہ افسوس ہے ان قلوب پر جو کسی شک و شبہ میں مبتلا ہیں۔ ھرم نے پھر عرض کیا کہ کچھ اور ارشاد فرمائیں بولے اے ابن حبان۔ آدم و حواؑ، نوح و موسیٰ اور داؤد علیہم السلام یہ تمام انبیا وفات پا گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی وصال ہو گیا۔ ابو بکرؓ و عمرؓ بھی فوت ہو گئے۔

اس پر ابن حبان بولے۔ میرا خیال ہے کہ حضرت عمرؓ تو ابھی فوت نہیں ہوئے حضرت اویس رضی بولے، نہیں تمہیں اس کا علم نہیں۔ مجھے علم ہے کہ وہ فوت ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے ان کے وفات پا جانے سے متعلق مطلع کر دیا ہے۔ پھر فرمایا۔ میں اور تم غرض ساری کائنات ناپائیدار ہے ہم سب کو ایک دن مرنا اور جان دینا ہے اور دنیا کی ہر شے آنی جانی ہے۔ کسی شے کو قرار و ثبات نہیں۔ سدا رہے نام صرف اللہ کا بس باقی ہوس۔ مگر تحریر کے فن میں صوفیوں کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ انہوں نے روایات کو بغیر کسی جرح و تعدیل کے من و عن قبول کر لیا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بہت سی بے سر و پا باتیں ان کی تحریروں میں داخل ہو گئیں۔ حتیٰ کہ اس سے ان لوگوں کو جو صوفیوں کے مسلک سے متفق نہیں لب کشائی کرنے کا موقع مل

گیا ۔ مثلاً ابو طالب مکی نے جو اپنے زمانے کے بہت بڑے صوفی تھے اپنی کتاب "قوت القلوب" میں لکھا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز جو عمر فاروق ثانی کہلاتے ہیں اور جن کی خلافت میں حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت ایسی ہی خوبیاں پائی جاتی تھیں ۔ بدیں طور معزز و محترم بنے کہ خلیفہ سلیمان بن عبدالملک نے اپنے زمانے کے ایک خدا رسیدہ بزرگ ابو حازم سے کہلا بھیجا کہ اپنی افطاری کا الشیاء مجھے عنایت فرما دیجئے ۔ چنانچہ ابو حازم نے تھوڑا سا ستو خلیفہ سلیمان کے لئے بھیج دیا ۔ خلیفہ نے مسلسل تین دن کا روزہ رکھا اور چوتھے دن اسی ستو سے روزہ کھولا ۔ پھر اس کے بعد وہ اپنی بیوی سے ملے جس سے حضرت عمر ثانی کے والد حضرت عبدالعزیز پیدا ہوئے ۔

علامہ ابن جوزی نے اپنی کتاب "مستظہری" میں اس غلط روایت پر نہایت شرح و بسط سے تبصرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس روایت کے معنی یہ ہوئے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز، خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کے پوتے تھے حالانکہ ایسا نہیں اور تاریخ کا ایک ادنیٰ سا طالب علم بھی یہ بات بخوبی جانتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کے چچیرے بھائی اور مروان ابن الحکم کے پوتے تھے ۔

مذکورہ بالا واقعہ ہم نے صوفی حضرات کی ان کتابوں سے لیا ہے جو اولیائے کرام کے خوارق عادات سے متعلق لکھی گئی ہیں ۔ خاص کر حضرت خواجہ فریدالدین عطار رحمتہ اللہ علیہ کی مشہور کتاب "سیرۃ الاولیا" سے ۔ مگر جہاں تک حقائق اور تاریخی واقعات کا تعلق ہے ۔ ایک فریدالدین عطار کیا ۔ بیشتر کتب

تصوّف ایسے ہی واقعات سے بھری پڑی ہیں جن میں دو چار کام کی باتیں نکل آنے کے بعد باقی تمام باتیں ایسی ہی ملتی ہیں جن کا تاریخی واقعات اور حقائق سے دُور کا بھی تعلّق نہیں۔ ہمارے خیال میں اس خرابی کا واحد اور سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ عقیدت کے تہہ در تہہ غلافوں میں حقیقت حال گم ہو کر رہ گئی ہے اور بعد کے آنے والے حضرات خاص کر صوفیائے کرام محبت اور عقیدت کی راہ سے مبالغہ کی حد تک اپنی تقریر یا تحریر کے ذریعے اولیائے کرام کے حالات اور واقعات کی تشہیر و اشاعت کرتے ہیں جن کی فریدالدین عطار کی سیرت الاولیاء جیسی بے شمار کتابوں میں لاتعداد مثالیں ملتی ہیں۔

الغرض صوفیہ کے یہاں بلاعدد اس قسم کے دیگر بہت سے واقعات ایسے ہیں جو تاریخ کے معیار اور اس کی شرطوں پر پورے نہیں اترتے اور بلاشبہ یہ محض قصّے کہانیاں ہیں جن کا وجود اندھی تقلید سے قائم ہے اور حقائق سے ان کا دور کا بھی تعلق نہیں۔

دراصل تقلید کا جذبہ ہر انسان کے جہل کی ایک قدرتی ضرورت ہے اور اس بنا پر اسے محض صوفیوں ہی تک محدود رکھنا شدید غلط فہمی اور ایک جاہلانہ تصوّر کہا جائے گا کیونکہ تصوف اور فقہ کے علاوہ دوسرے دینی علوم مثلاً حدیث، تفسیر اور کلام وغیرہ علوم میں بھی تقلید کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ تاہم تقلید اور کور تقلید کے درمیان ایک فرق ضرور ہونا چاہیئے جس سے واقعات کی تصحیح و تغلیط کا پتہ چل سکے اور ہدایت و گمراہی کا اندازہ ہو سکے۔

حضرت اویس قرنی کے اکثر حالات اور واقعات جو سیرت اور تاریخ کی اکثر کتابوں میں ملتے ہیں - اہلِ تصوف انہیں سلوک و معرفت کے حصول کا زینہ خیال کرتے ہیں مثلاً یہ کہ حضرت اویس قرنی کو لوگوں سے میل جول رکھنے کی بجائے ان سے الگ تھلگ رہنا پسند تھا - وہ بیوی بچوں کے جنجال میں پڑنے کی بجائے عمر بھر مجرد رہے - وہ آبادی سے دُور بھاگتے اور جنگل بیابان میں زندگی کے دن بسر کرتے تھے - غرض صوفیائے کرام نے ان حالات کے اسباب و علل پر غور کئے بغیر انہیں سطحی نظر سے دیکھا اور انہیں سلوک و معرفت کا زینہ سمجھ لیا - فی الجملہ سلوک کسے کہتے ہیں اور معرفت کیا ہے اس پر انہوں نے کبھی غور نہیں کیا -

سلوک و معرفت

سلوک شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ جیسے برف کے ڈلے کو ہانڈی میں ڈال کر آگ پر چڑھا دیا جائے تو برف کا ڈلا آہستہ آہستہ پگھلتے پگھلتے پانی بن جاتا ہے اور پھر اس کے بعد پانی بھی رفتہ رفتہ بھاپ کی شکل اختیار کرنے لگتا ہے - حتیٰ کہ برف کا ڈلا جو دیکھنے میں پتھر کی طرح سخت اور ٹھوس تھا گرمی کی حرارت کے باعث ہوا بن کر اڑ جاتا ہے - بالکل یہی صورت اُن ایسے انسانی نفوس کی ہے جو ازنا تُش کی بھٹی میں ڈالے جاتے ہیں - حتیٰ کہ وہ ابتدائی حالات سے منتقل ہو کر

درجہ بدرجہ ترقی کرتے ہوئے ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتے ہیں کہ جہاں ان میں اپنی ذات کا شخصی شعور باقی نہیں رہتا وہ عرش الٰہی کی سطح میں گم ہو جاتے ہیں اور اپنی انانیت کو یکسر بھول جاتے ہیں۔ صوفیوں کی اصطلاح میں انہی کو مقامات سلوک کہا جاتا ہے۔

مگر بایں ہمہ سلوک کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ وہ دنیا اور دنیا کے تمام مشاغل سے بے نیاز کر دیئے جانے کا نام ہے۔ نہیں بلکہ بقول شیخ اکبر صوفیوں میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو دنیا میں رہتے ہوئے دنیا کی محبت میں گرفتار نہیں ہوتے۔ وہ خرید و فروخت یعنی دنیاوی تجارتی کاروبار بھی کرتے ہیں اور اللہ کی یاد سے غافل بھی نہیں ہوتے حضرت شیخ ابن عربی الاندلسی انطاکی رحمۃ اللہ علیہ جو شیخ اکبر کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں اپنی کتاب "فتوحات مکیہ" کی جلد ثانی باب ۳۰۹ میں لکھتے ہیں کہ "مردان خدا" کی صرف تین قسمیں ہیں۔

ایک وہ ہیں جن پر دنیا کی لذتوں سے علیحدگی کا غلبہ آجاتا ہے اور وہ تمام اچھے کام جن کی اسلام کی شریعت نے تاکید کی ہے انجام دیتے ہیں۔ اور اس کے علاوہ ظاہر کی طرح اپنے باطن کو بھی ان چیزوں سے پاک رکھنے کی کوششوں میں لگے رہتے ہیں جن کی اسلام کی شریعت نے مذمت کی ہے مردان خدا کا یہ گروہ عبّاد (عبادت کرنے والے حضرات) کہلاتا ہے۔ ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب کوئی شخص دعا کرانے کے لئے ان کے پاس آتا ہے تو وہ اسے جھڑک دیتے ہیں اور کہتے ہیں بھائی ہیں بھلا اس قابل

کہاں جو کسی کے لئے دعا کروں۔ میری کوئی حقیقت نہیں

شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ عُبّاد اس طریقے کو عوام کے سامنے اس لئے اختیار کرتے ہیں تاکہ ان میں خود پرستی، خود بینی اور خود پسندی کے جذبات پیدا نہ ہونے پائیں۔

دوسرے وہ ہیں جو خدا کی کائنات میں اس کی ساری کارفرمائیوں کو دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہو رہا ہے۔ چنانچہ اس تاثر سے ان میں یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ خود کسی قسم کے فعل سے تعلق نہیں رکھتے۔ چنانچہ ریاکاری اور خود نمائی کا ان کے سامنے سرے سے کوئی سوال ہی باقی نہیں رہتا۔ وہ جب خیال کرتے ہیں کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی کر رہا ہے تو ان میں انانیت باقی نہیں رہتی اور دریافت کا یہی جذبہ پھر اُن کا "وجدان" بن جاتا ہے۔ یہ لوگ رجال اللہ کہلاتے ہیں۔

ہر چند "رجال اللہ" کا طبقہ بھی انہی باتوں کو اپناتا ہے جن کی عباد اللہ پابندی کرتے ہیں یعنی دنیا کی لذتوں سے علیحدگی پارسائی اور توکل وغیرہ۔ تاہم وہ عباد اللہ سے اس لحاظ سے مختلف ہیں کہ وہ اپنی کرامتوں کو عوام سے مخفی نہیں کرتے جیساکہ عباد اللہ کا شعار ہے۔ رجال اللہ چونکہ خیال کرتے ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے سب اللہ ہی کی طرف سے ہو رہا ہے اس لئے وہ عباد اللہ کے شعار کے برعکس چلتے ہیں اور اللہ کے کاموں کو چھپانے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

تیسرے وہ مردانِ حق آگاہ ہیں جو تمام اوامر و نواہی ادا کرتے ہیں اور

فرائض و سنن سے زیادہ نماز میں مشغول نہیں ہوتے۔ وہ بظاہر عام لوگوں کی طرح چلتے پھرتے اور کام کاج کرتے دکھائی دیتے ہیں، ان کی رفتار، گفتار اور لباس میں بھی کوئی ایسی بات دیکھنے میں نہیں آتی جس سے وہ عام لوگوں سے کچھ زیادہ علیٰحدہ طرز کے خیال کیے جائیں۔ وہ مسجدوں میں نماز کے لئے کوئی خاص الگ تھلگ مقام تلاش نہیں کرتے بلکہ جہاں کہیں بھی جگہ ملتی ہے وہیں کھڑے ہو جاتے ہیں مگر بباطن یہ لوگ دل ہی دل میں اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی ذات سے اس طرح وابستہ کیے رکھتے ہیں کہ گویا اللہ کی ذات کے سوا ان کے اندر اور کچھ نہیں اور اس معاملے میں وہ اس قدر پختہ، راسخ اور مستحکم ہوتے ہیں کہ انہیں لاکھ ہلانے کی کوشش کریں وہ اس مقام سے ذرا بھی نہیں ہل سکتے۔

یہ لوگ عبد اور معبود، آقا اور غلام، بندے اور مالک کے رشتے ہمیشہ تازہ رکھتے ہیں۔ خدا کے سامنے ان کی خاکساری، عاجزی، انکساری اور حاجت مندی کا احساس ان میں ہر حال میں قائم رہتا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان میں خود پرستی کے جذبات اور بڑے بن کر جینے کی تمنا کبھی پیدا نہیں ہوتی۔ وہ قدرت الٰہی کے ان قوانین کی پوری پوری پابندی کرتے ہیں جنہیں دنیا کا نظام چلانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے وضع کیا ہے۔ ہر چند یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ جو ہو رہا ہے اللہ ہی کی طرف سے ہو رہا ہے۔ یعنی وہی کھلاتا ہے وہی پلاتا ہے، وہی سلاتا ہے، وہی مارتا ہے اس کے اختیار کرنے میں وہ بڑی احتیاط سے کام لیتے ہیں۔

یہ لوگ اشیاء کے اسباب کی حکمتوں کو خوب پہچانتے ہیں اور ان مصلحتوں کو بھی خوب جانتے ہیں جو اشیاء میں مضمر ہیں۔ جناب شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ اللہ والوں میں یہی سب سے اونچا طبقہ ہے۔ یہی لوگ سادات طریقت ہیں۔ انہی لوگوں کو اللہ کی قربت سب سے زیادہ میسر ہے اور یہ سبب ہے ، بلاشبہ اس بات کا کہ یہ لوگ عوام کے مقابلے میں کوئی ایسا طرزِ عمل اختیار نہیں کرتے جو عوام کو ان سے جدا کر دے۔ اگرچہ شیخ اکبر نے صوفیوں کے پہلے دو طبقوں کو بھی سوان خداشناس اور حق آگاہ شمار کیا ہے۔ تاہم وہ تیسرے طبقے کے صوفیوں کے سب سے زیادہ مدّاح ہیں۔

اگرچہ صوفیوں کا یہ تیسرا فرقہ اس لحاظ سے کہ وہ اپنے آپ کو لوگوں کی نگاہ میں معزز و محترم نہیں کرنا چاہتا۔ اور نہ اپنے لئے عوام کے مقابلے میں کوئی تخصیص اور امتیاز کا طالب ہے۔ بلکہ صوفیوں کے اس فرقے سے ملتا جلتا دکھائی دیتا ہے جو دین کے احکام سے بے نیاز ہو کر اور اسلام کی شریعت سے بے تعلق ہو کر اسلام کی محبت کا دم بھرتا ہے اور فرقہ ملامتیہ کہلاتا ہے۔ تاہم ملامتیوں کی طرح نماز روزہ وغیرہ سے بے تعلق رہنے کی بجائے یہ لوگ اسلام کے شرعی قوانین کی پوری پوری پابندی کرتے اور اسلام کے تمام احکام کی بجا آوری میں پیش پیش رہتے ہیں۔ اگرچہ حضرت اویس قرنی بھی اپنے آپ کو دنیا کے لوگوں سے چھپائے رکھنے کے لئے نہایت خستہ حالی میں رہتے تھے حتیٰ کہ ستر پوشی کے لئے ان کے بدن پر ڈھانکنے کے لئے ڈھنگ سے کپڑا بھی نہیں ہوتا تھا۔ باگ ننگا دیکھ کر انہیں کپڑا اڑھا دیتے

اوران کی ظاہری حالت پر وہ لوگ جو بصیرت سے محروم تھے، ان کا مذاق اڑاتے اور پریشان کرتے تھے۔ تاہم حضرت اویس قرنی نے اس حالت کے سوا جو ہرگز خود اختیاری نہ تھی بلکہ مجذوبانہ تھی کبھی کوئی ایسا طرزِ عمل اختیار نہیں کیا جس سے اسلام کے احکامات کے خلاف بغاوت کی بو آئے۔ وہ عام طور سے دریائے فرات کے کنارے پر بیٹھ کر اپنے کپڑے دھوتے ——— اور اکثر وہیں پر بیٹھ کر نماز کے لئے وضو کرتے دکھائی دیتے تھے۔

اکل حلال

ایک مرتبہ حضرت اویس قرنی تین دن تک سخت فاقے میں رہے اور کھانے پینے کے لئے آپ کو کچھ بھی میسر نہ آسکا۔ آخر بھوک نے جب آپ کی طبیعت پر بے حد غلبہ پا لیا تو چونکہ تھے بعض گھر سے باہر تشریف لائے اور ایک راہ پر چل دیئے۔ چلتے چلتے راستے میں آپ نے ایک دینار پڑا دیکھا۔ طبیعت نے چاہا کہ اٹھا لیں اور اس سے اپنا کام نکالیں لیکن پھر جلد ہی اس خیال کے آنے سے اٹھاتے اٹھاتے رک گئے کہ یہ نہ معلوم کس ضرورت مند آدمی کا گرا ہو ممکن ہے وہ اس کی تلاش میں ادھر آنکلے اور اپنی گمشدہ شے پالے غرض حضرت اویسؓ قرنی اس دینار کو بغیر چھوئے یہ سوچ کر رک گئے کہ اب گھاس کھا کر ہی اپنی بھوک مٹائیں گے۔ اتفاق سے ابھی دو ہی قدم آگے بڑھنے پائے تھے کہ ——آپ نے راستے میں ایک بکری کو اپنے منہ میں گرم گرم

روٹی لئے نہ صرف آتے پایا بلکہ اس نے قریب پہنچتے ہی روٹی بھی آپ ہی کے سامنے ڈال دی یا دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیں کہ بکری کے منہ سے روٹی کسی طور پر گر گئی لیکن آپ نے باوجود شدت کی بھوک کے اسے بھی چھوا تک نہیں آپ نے خیال فرمایا کہ غالباً یہ بکری کسی شخص کی روٹی منہ میں دبا کر اٹھا لائی ہے اس لئے اس کا کھانا جائز نہیں۔

حضرت عمر فاروق جب اویس قرنی سے ملاقی ہوئے تھے تو آپ نے بھی انہیں کچھ نقدی دینی چاہی مگر انہوں نے لینے سے انکار کر دیا اور دل میں خیال کیا کہ جب ان کے ہاتھ پیر چلتے ہیں اور وہ اپنی نقدی کمانے کے لائق ہیں تو ایسی صورت میں وہ بخششیں کیوں قبول کریں پھر اس کے بعد اویسؓ نے دو درہم اپنی جیب سے نکالے اور حضرت عمرؓ کو دکھاتے ہوئے کہا کہ دیکھئے اگر آپ اس بات کی ضمانت دیں کہ میں انہیں خرچ کرنے کے بعد بھی زندہ رہوں گا تو میں آپ سے ضرور کچھ نہ کچھ لینے کے لئے بخوشی تیار ہوں۔

ممکن ہے اس مقام پر بعض لوگ یہ خیال کریں کہ حضرت عمرؓ کا اویس رضؓ قرنی کو دو درہموں کا پیش کرنا تحفے یا ہدیے اور نذرانے کے طور پر ہو گر سوال پیدا ہوتا ہے کس بات پر۔ اگر یہ بات اویس قرنی کے معاش کو سامنے رکھتے ہوئے پیش آئی ہو تو اسے ہرگز نذرانہ یا ہدیہ نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ وہ محض ایک اعانت نظر آتی ہے اور وہ لوگ جو سلوک کے مقامات سے ہو کر گذرتے ہیں ان چیزوں سے یکسر بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ البتہ جہاں تک ہدیے، نذرانے یا تحفے کی شرعی حیثیت کا تعلق ہے تو وہ ناجائز

نہیں ۔ چنانچہ آنحضرت کی سیرت پاک میں ایسے واقعات موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ آنحضرتؐ ہدیے اور تحفے قبول فرما لیتے تھے ۔ البتہ اگر صدقہ ہوتا تو اس سے ہاتھ روک لیتے کہ یہ صرف مستحق لوگوں کا حق ہے اور آنحضرتؐ نے اسی طرح زکوٰۃ بھی تمام بنی ہاشم کے لئے ناجائز قرار دے دی تاکہ دوسرے ضرورت مند لوگوں کے امداد سے محروم ہونے کا اندیشہ ہی باقی نہ رہنے پائے ۔

آس پاس کے رئیسوں اور بادشاہوں کی طرف سے آنحضرتؐ کی خدمت میں اکثر تحفے ، تحائف آتے رہتے تھے جنہیں آپ بہ طیب خاطر قبول فرما لیتے تھے ۔ ملک شام کے ایک سردار نے ایک مرتبہ آنحضرتؐ کی خدمت میں ایک سفید خچر تحفے کے طور پر پیش کیا ۔ اسی طرح مصر کے بادشاہ نے بھی ایک خچر بھیجا تھا اور ایک امیر نے آپ کو موزے بھی پیش کئے تھے ۔ یہ تمام اشیاء آنحضرتؐ نے بہ طیب خاطر قبول کیں اور بھیجنے والوں کا شکریہ بھی ادا کیا ۔ اس کے علاوہ آنحضرتؐ کا یہ بھی قاعدہ تھا کہ وہ جن لوگوں کے ہدیے اور تحفے قبول فرماتے انہیں ان کا صلہ بھی عنایت کرتے تھے جیسا کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ کے بیان سے واضح ہے کہ آنحضرتؐ ہدیہ قبول فرماتے تھے اور اس کا صلہ بھی دیتے تھے ۔

اب رہی بات احسان کی ۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اویس قرنیؒ اسے ایک احسان خیال کرتے تھے اور اسی سبب سے انہوں نے حضرت عمرؓ کے دو درہم ان کی خواہش کے باوجود نہیں لئے بلکہ ان کے لینے سے صاف

انکار کر دیا حق تو یہ ہے کہ اس سلسلے میں دراصل اویس نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا عمل سامنے رکھا ہے مثلاً حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے بھلا کون زیادہ جان نثار نبی ہو سکتا ہے مگر جب ہجرت کے وقت انہوں نے سواری کے لئے آنحضرت صلعم کی خدمت میں ناقہ پیش کیا تو آنحضرت صلعم نے انہیں پہلے قیمت ادا فرمائی پھر سوار ہوئے۔ پھر اسی طرح جب مدینے پہنچ کر مسلمانوں کے لئے ایک مسجد بنانے کی ضرورت پیش آئی تو وہ زمین جو مسجد کے لئے درکار تھی اور مدینے کے دو یتیم لڑکے اس کے مالک تھے وہ باوجود اس کے کہ زمین اللہ کے گھر کی تعمیر کے لئے مفت دینے کے خواہش مند تھے لیکن آنحضرت صلعم نے جب تک اصرار کر کے انہیں قیمت وصول کرنے پر مجبور نہ کر دیا مسجد کی تعمیر کا کام شروع نہ ہونے دیا۔

المختصر یہ کہ حزم و احتیاط کا یہ پہلو جو اصل میں آنحضرت صلعم ہی کے اس عمل کو سامنے رکھنے سے پیدا ہوا ہے۔ اویس قرنی ایسے اولیاء کے یہاں صرف اسی حد تک نہیں تھا بلکہ وہ نظریاتی اختلافات کے باعث خود اپنے ماں باپ کے مال و اسباب میں بھی اپنے آپ کو ان کا وارث اور مستحق خیال نہ کرتے تھے۔ چنانچہ روایت ہے کہ امام احمد بن حنبل کے معاصر امام ابوزرعہ حارث محاسبی جو صوفیوں کے سرخیل کہلاتے تھے اپنے باپ کی جائداد میں لاکھوں روپے کے مالک تھے۔ مگر ان کے اور ان کے پدر گرامی قدر کے نظریات ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ اس لئے باوجود جائز وارث ہونے کے اپنے باپ کی جائداد سے حارث محاسبی نے ایک حبہ تک لینا گوارہ

نہ کیا۔

حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حارث محاسبی ہمیشہ فقر و فاقہ میں مبتلا رہتے تھے۔ ایک دن جب وہ میرے ہاں تشریف لائے تو ان کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت بھوکے ہیں۔ میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ اگر اجازت ہو تو کچھ کھانا پیش کر دوں۔ مجھے اجازت ملی تو میں بجائے اپنے گھر سے کھانا لانے کے مہمان کی عظمت و فضیلت کے پیش نظر اپنے چچا کے گھر سے کھانا لے آیا۔ میرے چچا ایک دولت مند آدمی تھے۔ ان کے باورچی خانے میں طرح طرح کے کھانے ہر وقت تیار ملتے تھے چنانچہ میں جب مختلف قسم کے لذیذ کھانوں کا سجا ہوا خوان لے کر جناب حارث کی طرف بڑھا تو جناب حارث نے اس میں سے فقط ایک لقمہ ہی لیا تھا کہ معاً ایک خیال کے آجانے سے وہ لقمہ ان کے حلق سے نیچے نہ اتر سکا۔ ہر چند جناب حارث محاسبی لقمے کو نگلنے کے لئے منہ میں گھماتے رہے مگر ہزار کوشش کے باوجود وہ اسے نگلنے سے قاصر رہے اور آخر کار تنگ آکر منہ سے لقمہ اگل دیا۔ میں نے آگے بڑھ کر عرض کیا کہ حضور اس کا سبب کیا ہے۔ فرمایا۔ بھائی مشتبہ کھانے سے پیٹ بھرنا کیا۔ میری ناک تو اس کی بو تک کو برداشت نہیں کر سکتی۔ حوالے کے لئے دیکھئے تاریخ بغداد خطیب صفحہ ۲۲۲، ج ۸۔

معمولاتِ شب و روز

حضرت اویسؓ قرنی دن رات اللہ تعالیٰ کی عبادت رکوع و سجود میں لگے رہتے تھے۔ گویا یہ ان کا زندگی بھر کا معمول رہا۔ ربیع بن خثیم کہتے ہیں کہ میں ایک دن جب اویسؓ قرنی سے ملنے گیا تو دیکھا کہ وہ فجر کی نماز میں مشغول ہیں میں نے اس خیال سے کہ ان کی عبادت میں ہرج واقع نہ ہو ان کا انتظار کرنا مناسب جانا اور دل میں سوچا کہ جب نماز سے فراغت پائیں گے تو ملاقات کروں گا مگر اویسؓ قرنی عبادت میں اتنے منہمک ہوئے کہ فجر کی نماز سے ظہر کی نماز تک برابر مشغول رہے۔ پھر اس کے بعد ظہر سے عصر تک اور عصر سے مغرب تک کی نماز تک یہی صورت برابر قائم رہی۔ پھر میں نے خیال کیا کہ شاید اب وہ کچھ دیر کے لئے ضرور رک جائیں گے مگر میں نے دیکھا کہ انہوں نے عشا سے فجر کی نماز تک بھی مسلسل یہی صورت قائم کئے رکھی۔ الغرض حضرت اویسؓ قرنی کے یہی شب و روز تھے کہ روزے رکھتے اور نمازیں پڑھتے چلے جاتے تھے۔ بالعموم حضرت اویس قرنی ہمیشہ روزہ رکھتے تھے اور اکثر مواقع ایسے بھی آتے کہ ان کے پاس افطاری کے لئے کچھ بھی نہ ہوتا تھا وہ عام طور پر کھجوروں کی گٹھلیاں بیچ کر اپنے لئے روزی کا سامان مہیا کرتے تھے اور اگر کہیں سے خشک خرما میسر آجاتا تو اسے افطار کے لئے رکھ لیتے اور اگر ضرورت سے زیادہ مقدار میں بہم پہنچتا تو گٹھلیاں فروخت کر کے

اس کی قیمت غریبوں میں خیرات کر دیتے تھے ۔

اسیر بن جابر کہتے ہیں کہ ہم لوگ جنہیں عبادت سے غیر معمولی شغف رہتا ہے جب کوفے میں ذکر و شغل کے ایک حلقے میں اکٹھے ہوتے اور سب مل کر اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول ہو جاتے تو ہمارے ساتھ اویس قرنی بھی شریک ہو جاتے سچ پوچھو تو سب سے زیادہ اویس قرنی ہی کا ذکر ہم سب پر اثر انداز ہوتا تھا ذکر و شغل کے اس حلقے میں عام طور پر قرآن حکیم کی تلاوت اور نماز ہوتی تھی ایک مرتبہ جب اویس قرنی اس حلقے میں شریک نہ ہوئے تو اصحاب حلقہ نے آپ کی کمی کو شدت سے محسوس کیا ۔ اسیر بن جابر سمجھے کہ شاید آپ بیمار پڑ گئے ہوں گے ۔ وہ اسی خیال میں آپ کے گھر پہنچے اور نہ آنے کی وجہ دریافت کی فرمایا میرے پاس چادر نہ تھی یہ سن کر اسیر بن جابر نے ان کی خدمت میں اپنی چادر پیش کر دی مگر انہوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میرے ہم قوم دیکھ لیں گے تو کیا کہیں گے ۔ وہ غالباً یہی سمجھیں گے کہ اس ریاکار کو دیکھو کہ ایک آدمی کے ساتھ لگ کر کیسی ترکیب اور کیسے دھوکے سے اس کی چادر اس سے اڑا لی مگر جب اسیر بن جابر کا اصرار حد سے بڑھ گیا تب انہوں نے مجبوراً وہ چادر قبول کر لی ۔

ظاہر بین جو حقیقت نہیں جانتے تھے وہ حضرت اویس قرنی کی حالت کو دیکھ کر بجائے مجذوب خیال کرنے کے انہیں ریاکار خیال کرتے اور ان پر طرح طرح کے نشتر کرتے اور ان کا مذاق اڑاتے تھے ۔ جب حضرت اویس رضؓ قرنی وہی چادر اوڑھے اسیر بن جابر اور دوسرے اصحاب کے ہمراہ جیسے ہی ایک

مجمع کے سامنے سے گزرے تو انہیں دیکھ کر لوگ آپس میں کہنے لگے کہ ذرا دیکھنا اس ریاکار کو ایک شخص کے ساتھ کیسا چمٹا رہا۔ حتیٰ کہ اسے دھوکا دے کر اس سے اس کی چادر لے اڑا۔

اسیر بن جابر نے جب لوگوں کی یہ بات سنی تو ان سے مخاطب ہو کر بولے اے لوگو تمہیں کیا ہو گیا جو ایسے الزام لگاتے ہو۔ کیا تمہیں شرم نہیں آتی جو اس طرح اللہ کے ایک نیک بندے کو مطعون کرتے ہو۔ خدا کی قسم جب میں نے چادر پیش کی تو انہوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا یہ تو ایک صرف میرا بڑھتا ہوا تقاضہ اور اصرار تھا جس سے مجبور ہو کر انہوں نے میری طرف سے اس چادر کے تحفے کو قبول کیا ورنہ اس کی انہیں ضرورت نہیں تھی

ابو الاحوص کہتے ہیں کہ میرے ایک رفیق نے بیان کیا کہ ایک روز مراد قبیلے کا ایک شخص حضرت اویس قرنی کے پاس گیا اور سلام کے بعد اس نے پوچھا، اے اویس تمہارا حال کیسا ہے؟ فرمایا اللہ کا احسان ہے جیسے تیسے بھی ہے اچھا ہے۔ پھر اس نے پوچھا کہو لوگ تم سے کس طرز عمل سے پیش آتے ہیں ان کا سلوک تم سے کیسا ہے؟ فرمایا تم یہ بات ایسے آدمی سے پوچھتے ہو جسے شام کے بعد صبح کے ملنے کا یقین اور صبح کو شام کے ملنے کی امید نہیں۔ موت نے کسی شخص کے لئے خوشی کا محل باقی ہی نہیں رکھا۔ اور ہر خائن خدا نے مومن کے لئے سونے چاندی کی کوئی وقعت اور قدر و قیمت ہی نہیں رہنے دی اور خدا کے کاموں میں مومن کی فرض کی ادائی نے ان کا کوئی دوست باقی نہیں چھوڑا۔ خدا کی قسم ہم لوگ چونکہ اچھے

کام کرنے کی لوگوں کو تلقین کرتے ہیں اس لئے انہوں نے ہمیں اپنا دشمن سمجھ لیا ہے۔ اور اس کام میں ہمارے خلاف انہیں فاسق مددگار مل گئے ہیں لیکن یاد رکھو بخدا مجھے ان کا یہ طرز عمل اور سلوک حق بات کہنے سے کبھی نہیں روک سکتا چاہے وہ مجھ پر کتنی ہی الزام تراشی کیوں نہ کریں۔

درحقیقت حضرت اویسؓ قرنی طبعاً مکروہات دنیا سے الگ تھلگ رہنا اور گوشہ نشین ہونا بے حد پسند کرتے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ دنیا والے اُن کے مقام و منصب اور اُن کی فضیلت سے واقف ہوں۔ لہٰذا وہ اپنے حالات کو مخفی رکھنے کے لیے دنیا والوں کی نگاہوں سے چھپتے پھرے اور اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے انہوں نے کچھ اس طرح سے اپنی زندگی بسر کرنا مناسب جانا کہ جس سے وہ لوگوں کی نگاہوں کا مرکز نہ بننے پائیں۔

ہر چند حضرت اویسؓ کو ذات رسالت مآب سے خیر التابعین کا لقب عطا ہوا وہ بلاشبہ بڑے مرتبے اور اونچے پایہ کے بزرگ تھے۔ تاہم ان کی بجذوبانہ شکل و صورت کے باعث لوگ انہیں ان کے مقام و منصب کے مطابق نہ پہچان سکے اور جب لوگوں کو ان کے رتبے اور درجے کا پتہ چلا اس وقت وہ لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ حتیٰ کہ ہرم بن حیان کو ملاقات کا شرف بخشنے کے بعد وہ ایسے غائب ہوئے کہ جنگ صفین کے برپا ہونے تک ان کا کہیں پتہ نہ چل سکا۔

جنگ جمل اور جنگ صفین جو مسلمانوں کی اجتہادی غلطی کے باعث برپا ہوئیں اور ان جنگوں میں حصہ لینے والے تمام صحابہ کا موقف دینی تھا

دنیاوی نہ تھا۔ حضرت اویس قرنیؓ کے لوگوں سے الگ تھلگ رہنے اور دور ہونے کے اسباب کو کسی حد تک ان جنگوں کے اسباب پہ ایک نگاہ ڈالنے سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔

حضرت ہرم بن حیان کی ملاقات

حلیہ حضرت ہرم بن حیان جنہیں حضرت اویس قرنیؓ کی تمنائے زیارت میں کوفہ جانے کا موقع ملا اور ملاقات کے اشتیاق کا جذبہ انہیں کشاں کشاں حضرت اویسؓ قرنی کے پاس لے گیا۔ وہ کہتے ہیں حضرت اویس قرنی ایک فربہ اندام اور سخت گندم گوں آدمی تھے۔ ان کا سر منڈا ہوا تھا۔ داڑھی گھنی تھی۔ بدن پہ بال زیادہ تھے۔ چہرہ بہت بڑا اور مہیب تھا۔

لباس میں صوف کی ایک چادر اور صوف کا ایک ازار ہوتا تھا اور اکثر اوقات یہ بھی میسر نہ آتا تھا۔ وہ عام طور پہ ننگے بدن رہتے تھے اور لوگ یہ حالت دیکھ کر ان کی خدمت میں چادر لا کر پیش کر دیتے۔ الغرض کھانے پینے اور پہننے کی چند اشیا کے سوا وہ اپنے پاس اور کوئی شے نہ رکھتے تھے۔ گھر بار اور بیوی بچوں کے علائق سے ابتدا ہی سے آزاد رہے۔

ہرم بن حیان کہتے ہیں کہ جب میں اویس قرنی کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے فرمایا۔ ہرم بن حیان، اللہ تعالیٰ تم پر اپنا رحم فرمائے۔ میرے بھائی تم کیسے ہو؟ تمہیں یہ کیونکر معلوم ہوا کہ میں یہاں رہتا ہوں؟ میرا

پتہ تمہیں کس نے بتایا۔ ہرم کہتے ہیں کہ میں یہ سن کر بے حد حیران ہوا کہ انہیں میرے اور میرے باپ کے نام کا علم کیسے ہوا۔ حالانکہ اس سے پہلے نہ انہیں میں نے کبھی دیکھا تھا اور نہ انہوں نے مجھے کبھی دیکھا۔ میں نے ان سے عرض کیا قبلہ یہ تو بتائیے آپ مجھے اور میرے باپ کو کیسے جانتے ہیں۔ فرمایا خدائے علیم و خبیر نے مجھے آگاہ کیا ہے۔ پھر فرمایا جب تمہارے نفس نے میرے نفس کے ساتھ گفتگو کی اسی وقت سے میری روح نے تمہاری روح کو پہچان لیا۔ اور دیکھو! مومنین کرام چاہے آپس میں کبھی نہ ملے ہوں اور نہ ان میں کوئی باہمی جان پہچان اور بات چیت کرنے کا موقع آیا ہو لیکن اس کے باوجود وہ ایک دوسرے سے تعارف رکھتے ہیں اور خدا کی روح کے ذریعے سے آپس میں بات چیت کرتے ہیں۔ الغرض مکانی اور جسمانی حیثیت سے وہ ایک دوسرے سے کتنے ہی دور کیوں نہ ہوں روحانی اعتبار سے ان میں کبھی کوئی بُعد قائم نہیں ہوتا۔

ہرم بن حیان کہتے ہیں کہ پھر میں نے عرض کیا، اچھا قرآن حکیم ہی کی کوئی آیت سنا دیجئے۔ مجھے آپ کی زبان سے قرآن حکیم سننے کی بڑی تمنّا ہے میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے آپ کو محبوب رکھتا ہوں۔ میرے لئے دعا فرمائیں اور کچھ نصیحتیں بھی کریں تاکہ میں انہیں ہمیشہ یاد رکھوں۔ انہوں نے میری گذارش سن کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور اعوذ باللہ السمیع العلیم من الشیطان الرجیم پڑھ کر چیخ ماری اور زار و قطار رونے لگے اور فرمایا میرے رب کا ذکر بلند ہے۔ سب سے زیادہ اچھا کلام اس

کہا ہے۔ یہ کلمات فرما کر پھر یہ آیت پڑھی ما خلقنا السمٰوٰت والارض ..... اور ایک چیخ مار کر ایسے بے سدھ ہو کر گرے میں نے خیال کیا کہ مر گئے الغرض ہوش میں آنے کے بعد پھر اویس قرنی بولے، اے حرم بن حیان! تمہارے باپ مر چکے۔ عنقریب تمہیں بھی مرنا ہے۔ ابو حیان کے لئے جنت ہے کہ دوزخ نہیں کہہ سکتے۔ اے ابن حیان! سنو حضرت آدم (ہم سب کے باپ) مر گئے۔ حضرت حوا (ہم سب کی اماں) مر گئیں، اے ابن حیان! تمہیں علم ہے کہ نوح اور ابراہیم علیہما السلام مر گئے۔ موسیٰ نجم الرحمٰن مر گئے داؤد خلیفۃ الرحمٰن مر گئے۔ محمد رسول اللہ وفات پا گئے۔ اے ابن حیان! خلیفۃ المسلمین حضرت ابو بکر صدیقؓ فوت ہو گئے اور اے میرے بھائی حضرت عمر فاروق بھی انتقال کر گئے۔ پھر یہ کہہ کر انہوں نے واعمر کا نعرہ لگایا اور اُن کے لئے رحمت کی دعا کی۔ یہ دیکھ کر حرم بن حیان بولے، اے اویس، حضرت عمر فاروق خلیفۃ المسلمین تو ابھی حیات ہیں (یہ ان کی خلافت کے آخری زمانے کا واقعہ ہے) فرمایا۔ جو کچھ میں نے کہا ہے اگر تم اس کو سمجھنے کی کوشش کرو تو خود جان لو گے کہ ہمارا تمہارا شمار مردوں ہی میں ہے۔ ہونے والی بات ہو چکی۔

اس کے بعد اویس قرنیؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجا اور چند مختصر دعائیں پڑھیں، پھر فرمایا، اے حرم بن حیان۔ کتاب اللہ پر عمل اور صلحائے امت سے ملاقات کرو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجو بس یہی میری وصیت ہے۔ میں نے اپنی اور تمہاری موت کی

خبر دے دی، آئندہ موت کو ہمیشہ یاد رکھنا اور ایک لمحے کے لئے بھی اس سے غفلت نہ کرنا۔ واپس جاکر مسلمانوں کو ڈرانا اور نصیحت کرنا۔ اور خبردار جماعت سے الگ نہ ہونا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بے خبری کے عالم میں تمہارا دین ہاتھ سے جاتا رہے اور تمہیں قیامت میں جہنم کی آگ کا سامنا کرنا پڑے

پھر حضرت ہرم بن حیان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت اویس رض نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ اے اللہ! اس شخص کا خیال ہے کہ وہ تیری خوشنودی کے لئے مجھ سے محبت کرتا ہے اور اب تیرے لئے ہی اس نے مجھ سے ملاقات کی۔ اے اللہ! جنت میں اس شخص کا چہرہ مجھے پہچنوانا۔ اور مجھے اپنے گھر دارالسلام میں اس سے ملوانا۔ اور اے اللہ! یہ شخص دنیا میں جہاں کہیں بھی رہے تیری حفاظت اور امن وامان میں رہے۔ اس کی کھیتی باڑی کو جس پر یہ اپنی زندگی کے دن بسر کرتا ہے اسی کے پاس رہنے دے، اسے تھوڑی سی دنیا پر خوش رہنے کی توفیق دے اور دنیا سے جو حصہ تو نے اسے دیا ہے وہ اس کے لئے آسان کر دے۔ اسے اپنی بخششوں اور نعمتوں پر شاکر بنا دے، اور اے اللہ اسے جزائے خیر دے۔

ہرم بن حیان کے حق میں یہ دعائیں کرنے کے بعد پھر بولے "اے ہرم بن حیان اب میں تمہیں خدا کے سپرد کرتا ہوں۔ اچھا سلام علیک ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔ اب آج کے بعد میں تمہیں اپنے پاس نہ دیکھوں اس لئے کہ مجھے تنہائی پسند اور شہرت سے نفرت ہے۔ جب تک میں دنیا کے لوگوں کے ساتھ زندہ رہوں گا۔ انتہائی غم و آلام میں مبتلا رہوں گا

اس لئے میں نہیں چاہتا کہ اب تم مجھے دیکھنے کی کوشش کرو اور میں تمہیں دیکھنے کی۔ مجھے تم یاد کرتے اور میرے لئے دعائے خیر کرتے رہنا اور بس! اللہ اللہ! خیر سلا اور سنو! میں بھی تمہیں دعائے خیر سے یاد کرتا رہوں گا۔
اس واقعے کے بعد حضرت اویس قرنی ایک راہ پہ ہو لیے۔ ہرم بن حیان جہاں تک ان کی حد نظر تھی انہیں جاتے ہوئے دیکھتے رہے حتیٰ کہ وہ ایک گلی میں ایسے داخل ہوئے کہ پھر کہیں ان کا سراغ نہ مل سکا۔

درود شریف

حضرت اویس قرنیؓ جب تک حیات رہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر خود بھی درود و سلام بھیجتے رہے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتے رہے۔ درود شریف کا مطلب کیا ہے اور اسے مسلمانوں پر کیوں لازم کیا گیا ہے کہ وہ صبح و شام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجتے رہیں۔ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ
درود شریف حقیقت میں ایک دعا ہے جس میں خود مسلمانوں ہی کی اپنی بھلائیاں مضمر ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق کہ جو شخص قوم یعنی مسلمانوں کی سربلندی کے لیے کوشش کرتا ہے۔ وہ دراصل اسلام ہی کے دین کی سربلندی کا کام کرتا ہے پس جن بزرگان دین کو اسلام کی سربلندی کے لیے مسلمانوں سے محبت ہے۔ وہ دن رات آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات پر درود و سلام بھیجتے رہتے ہیں چنانچہ حضرت اویس قرنیؓ کثرت کے ساتھ درود شریف پڑھتے رہتے تھے ۔

درود، فارسی زبان کا لفظ ہے ۔ اس کے معنی مختلف ہیں جو موقع محل کے مطابق استعمال میں آتے ہیں ۔ درحقیقت یہ لفظ عربی زبان کے لفظ صلوٰۃ کا ترجمہ ہے ۔ اس لئے جو مطالب الگ الگ صلوٰۃ کے ہیں وہی درود کے ہیں ۔ مثلاً صلوٰۃ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو تو اس کے معنی "رحمت" کے ہیں ۔ اگر فرشتوں کی طرف سے ہو تو اس کے معنی "استغفار" کے ہیں اگر انسانوں کی طرف سے ہو تو اس کے معنی "دعا" کے ہیں اور اگر حیوانوں کی طرف سے ہو تو اس کے معنی "تسبیح" کے ہیں ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ ۔ درود بھیجنے کا مسلمانوں کو خود اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے ۔ اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ ط یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ہ (سورہ احزاب قرآن حکیم) بے شک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے نبی کریم محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتے ہیں اے مسلمانو تم بھی نبی اکرم صلعم پر بہت درود اور سلام بھیجا کرو ۔

اس آیہ مبارکہ میں صلوٰۃ کا لفظ ، اللہ تعالیٰ کی طرف ، اس کے فرشتوں اور مسلمانوں کی طرف سے آیا ہے جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کہ صلوٰۃ کا لفظ اپنے موقع محل کے مطابق مختلف معنی رکھتا ہے ۔ اس لئے اب سلیس ترجمہ اس آیہ مبارکہ کا یوں ہے ۔

اللہ تعالیٰ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم پر اپنی رحمت نازل فرماتا ہے اور اس کے فرشتے اللہ سے نزول رحمت کے لئے دعا کرتے ہیں پس اے مسلمانو (مسلو) تم بھی اللہ تعالیٰ سے رحمت کے نزول کی دعا کرتے رہا کرو۔

جیسا کہ مسلمانوں کے لئے یہ ارشاد ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود (صلوٰۃ) بھیجیں ایسا ہی اللہ تعالیٰ نبی اکرم سے بھی فرماتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے صَلِّ عَلَيْهِمْ إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ (سورۃ توبہ قرآن حکیم) اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود آپ بھی ان مسلمانوں پر نزول رحمت کی دعا کرتے رہیں بے شک آپ کا نزول رحمت کے لئے دعا کرتے رہنا ان کے لئے سکون اور اطمینان کا باعث ہے۔

صلوٰۃ کے معنی جیسا کہ مختلف نسبتوں کی صورت میں مختلف ہونے کے ہم اوپر بتا چکے ہیں اس کے علاوہ صلوٰۃ کے معنی ایک خاص دعا کے بھی ہیں جیسے نماز کہتے ہیں۔ قرآن حکیم میں نماز کے لئے الصلوٰۃ کا لفظ ہی آتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

أَقِيمُوا الصَّلَاةَ إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَّوْقُوتًا (سورہ نسآ قرآن حکیم) پابندی کے ساتھ فرض نماز ادا کرتے رہو۔ بلاشبہ تحریری فرمان کے ذریعے سے مقررہ اوقات پر فرض نماز کا ادا کرنا مسلمانوں (مومنوں) پر لازم کر دیا گیا ہے۔ نماز کے معنی میں صلوٰۃ کا لفظ قرآن حکیم کی بیشتر آیات میں آتا ہے مثلاً فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ اپنی نماز میں انکساری (خشوع) کرنے والے ہیں (سورہ المومنون قرآن حکیم) عَلَىٰ صَلَوَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ اپنی تمام نمازوں کے ادا کرنے میں تمام

ارکانِ نماز کی حفاظت کرتے ہیں (سورۃ المومنون قرآن حکیم) فِیْ صَلَاتِھِمْ سَاھُوْنَ اپنی ہر نماز کے ادا کرنے میں سستی کرتے ہیں (سورہ الماعون قرآن حکیم) آخر میں ایک بات اور ذہن میں رکھنے کے لائق ہے وہ یہ کہ قرآنِ حکیم میں جہاں کہیں صَلُّوا صَلّٰی یُصَلُّوْنَ اور یُصَلِّی یعنی صلوٰۃ کے مشتقات افعال آتے ہیں ان کے معنی درود پڑھنے والوں کے ہیں نماز پڑھنے والوں کے ہیں۔ بخلاف اس کے قرآن حکیم میں جہاں کہیں مُصَلِّیْ مُصَلُّوْنَ اور مُصَلِّیْنَ کے الفاظ آتے ہیں۔ ان کے معنی نماز پڑھنے والوں کے ہیں، درود پڑھنے والوں کے نہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے کا مسلمانوں کو بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے مگر اس سے آنحضرتؐ کی ذات والا صفات کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں اس کی کوئی صراحت نہیں فرمائی البتہ مسلمانوں پر صلوٰۃ بھیجنے کا فائدہ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں یہ فرمایا ہے هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْکُمْ وَ مَلٰٓئِکَتُہٗ لِیُخْرِجَکُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ وَکَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا (سورۃ الاحزاب قرآن حکیم) وہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جو اے مسلمانوں تم پر نزولِ رحمت کرتا ہے اور اس کے فرشتے بھی تمہارے لئے دعا کرتے ہیں تاکہ تمہیں اندھیرے سے روشنی میں لائے اور وہ مسلمانوں (مومنوں) پر اپنا رحم کرنے والا ہے۔

مندرجہ بالا آیات قرآنی کے حوالے سے یہ بات اب قطعی طور پر

واضح ہو گئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں جو درود پڑھا کرتے تھے وہ یہ ہے اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ اے اللہ اپنی رحمت کا نزول محمدؐ کی ذات پر بھی کر اور محمدؐ کی امت (آل) پر بھی اپنی رحمت نازل فرما۔ یعنی پیغمبر اسلام یہی درود پڑھا کرتے تھے۔ اور اب اہل اسلام آنحضرتؐ کی پیروی کرتے ہوئے اضافے کے ساتھ ہر نماز میں جو درود پڑھتے ہیں۔ وہ یہ ہے۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَ عَلٰی آلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ٥ اے اللہ اپنی رحمت نازل فرما محمدؐ پر اور آل محمدؐ پر بھی جس طرح تو نے اپنی رحمت نازل فرمائی ابراہیمؑ پر اور آل ابراہیم پر۔ بلاشبہ تیری ذات پاک اور بلند و برتر ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آل محمدؐ کا اطلاق کن پہ ہوتا ہے اور درود شریف اضافے کے ساتھ کیوں پڑھتے ہیں؟ ان باتوں کا جواب قرآن حکیم سے کیا ملتا ہے؟ اس ضمن میں ہمیں ذرا تھوڑی سی تفصیل کے ساتھ گفتگو کرنی پڑے گی۔

آل عربی زبان کا لفظ ہے اور قرآن حکیم میں اکثر مقامات پر مرکبات کی صورت میں آتا ہے مثلاً آل ابراہیم، آل عمران، آل یعقوب، آل لوط، آل موسیٰ، آل ہارون اور آل فرعون وغیرہ وغیرہ

عربی زبان میں آل کے معنی کہیں اولاد کے ہیں اور کہیں قوم کے جیسے آل ابراہیم سے حضرت ابراہیمؑ کی اولاد کے معنی لئے جاتے ہیں یا آل عمران سے کہ حضرت ابراہیمؑ کے چھوٹے بیٹے حضرت اسحاقؑ کا لقب عمران تھا

ان کی اولاد مراد لی جاتی ہے۔ اسی طرح سے آلِ موسیٰؑ کے معنی حضرت موسیٰ کی قوم (بنی اسرائیل) کے لئے جاتے ہیں کیونکہ حضرت موسیٰ کے کوئی صلبی بیٹا نہیں تھا اور آلِ فرعون سے مصر کے بادشاہ کی وہ قوم جس کا نام قبطی تھا، مراد لی جاتی ہے کیونکہ وہ فرعون کو خدا تسلیم کرتی اور اس کے طریقے پر چلتی تھی

الغرض بالکل اسی طرح آلِ محمد کے معنی بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے ہیں کہ جس طرح آلِ موسیٰ کے معنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم بنی اسرائیل کے ہیں کہ حضرت موسیٰ بھی انہیں میں سے تھے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کوئی صلبی بیٹا نہ تھا اس لئے آپ کی قوم آپ کی آل کہلائی ایسے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسل بھی آپ کے کسی صلبی بیٹے سے نہیں چلی اس لئے آپ کی امت بھی اسی طرح آلِ محمدؐ کہلاتی ہے۔

بخلاف اس کے جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے خاندان تک آلِ محمد کا اطلاق محدود کرتے ہیں۔ ان کے خیالات کی قرآن و سنت اور حدیث نبوی سے کہیں تائید نہیں ہوتی۔ پھر آگے ان لوگوں میں بھی جو آلِ محمدؐ کے معنی صرف رسالت مآب کے خاندان تک محدود جانتے ہیں دو طرح کے خیالات پائے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ آلِ محمدؐ کا اطلاق۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم۔ آنحضرت کی لخت جگر سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراء۔ آنحضرتؐ کے چچیرے بھائی اور داماد سیدنا علی ابن ابی طالب۔ اور آنحضرتؐ کے دونوں نواسوں سیدنا امام حسن اور سیدنا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما پر ہوتا ہے۔ دوسرا یہ

کہ نہیں ان حضرات کے ساتھ ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عم محترم سیدنا عباس بن عبد المطلب اور آپ کی اولاد پر لعد سیدنا علی ابن ابی طالب کے باقی دو بڑے بھائیوں حضرت عقیل ابن ابی طالب اور حضرت جعفر طیار ابن ابی طالب اور ان کی اولاد پر بھی ہوتا ہے۔

بلاشبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تمام خاندان بنی ہاشم جسے پیغمبر اسلام کی قرابت اور قبول اسلام کی سعادت حاصل ہے تعظیم و سیادت کا مستحق ہے اور ان سے محبت رکھنا زندہ ایمان کی علامت ہے لیکن جہاں تک قرآن حکیم کی روشنی میں آل محمدؐ کا تعلق ہے تو اس کے معنی کہیں بھی صرف خاندانِ رسالت تک محدود نہیں بلکہ اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری امت مراد ہے دلیل اس کی سب سے بڑی یہ ہے کہ اگر آل محمد کے معنی صرف پانچ یا اس سے زائد نفوس خاندان رسالت کے ہوتے تو قرآن حکیم میں آلِ ابراہیم و آل عمران کی طرح آل محمدؐ کے الفاظ بھی ضرور آتے مگر واقعہ یہ ہے کہ قرآن حکیم میں نہ کہیں آلِ محمد کا لفظ آیا ہے اور نہ خاندانِ رسالت کے کسی فرد سیدنا عباسؓ یا سیدنا علیؓ اور ان کی اولاد ہی کا کوئی ذکر آیا ہے اور نہ ان کا نام آیا ہے۔ ہاں البتہ سورہ احزاب قرآن حکیم میں سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراؓ کے سلسلے میں ایک ذکر ضرور آیا ہے مگر وہ بھی ایک نسوانی معاشرتی اور اخلاقی پیرائے میں بغیر نام کے اور بجائے واحد کے جمع کے صیغے میں آیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَ بَنٰتِكَ وَ نِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ ؕ

کہہ دیجئے اے نبی اپنی بیویوں، اپنی بیٹیوں اور تمام مسلمانوں کی بیویوں سے کہ وہ اپنے اوپر بڑی چادر کا حصہ لپیٹ لیا کریں تاکہ بدن پوری طرح سے ڈھک جائے۔

اب رہا یہ سوال جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت پر درود بھیجنے کا ذکر قرآن حکیم میں آتا ہے کیا ایسا ہی ذکر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی آل پر بھی درود بھیجنے کا قرآن حکیم میں آتا ہے اور اگر نہیں آتا تو مسلمانوں کو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی آل پر درود بھیجنے پر کیوں مکلف کیا گیا ہے۔

مختصر طور پر اس کا جواب یہ ہے کہ وہ دین جس کی ابتدا حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے میں ہوئی قرآن حکیم کے بیان کے مطابق اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں پہنچ کر اسلام کا نام پایا۔ اسلام کے معنی کامل یقین اور مکمل ایمان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرنے کے ہیں۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے۔ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (سورہ بقر قرآن حکیم) جب ان کے رب نے ان سے کہا کہ اسلام لاؤ یعنی میری فرمانبرداری کرو۔ انہوں نے کہا میں اسلام لایا یعنی میں نے اس کی فرمانبرداری کو اپنا شیوہ بنالیا جو دو جہانوں کا رب ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنی زندگی میں جو امتحان کے دو اہم واقعے پیش آئے وہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور اطاعت گزاری یعنی اسلام کے

بہت بڑے منتے ہیں۔ ان میں پہلا یہ کہ برسوں کی آرزوؤں کے بعد بڑھاپے میں جب اولاد کا منہ دیکھنے کا موقع نصیب ہوا تو انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے اسماعیل کو مع ان کی والدہ ماجدہ حضرت ہاجرہ سلام اللہ علیہا کے عرب کے ریگزار میں اس مقام پر تن تنہا چھوڑ آئیں جہاں آج اسلام کا مرکز عرب کا مشہور شہر مکہ معظمہ واقع ہے۔

امتحان کا دوسرا واقعہ جو پہلے سے کہیں زیادہ سخت تھا حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ پیش آیا کہ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی عزیز ترین شے کی قربانی دینے کا حکم دے رہا ہے۔ یہ خواب متواتر تین روز تک آتا رہا اور حضرت ابراہیم روزانہ اونٹوں کی قربانی دیتے رہے۔ مگر تیسرے دن جب آپ نے خواب میں پھر یہی دیکھا کہ جناب اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیمؑ کو حکم دے رہا ہے کہ اے ابراہیم اٹھ اور اپنی عزیز ترین شے کی قربانی کر تو حضرت ابراہیم نے اپنے دل میں کہا کہ اپنے جگر کے ٹکڑے اور اکلوتے بیٹے کے سوا دنیا میں اور کونسی شے عزیز ترین ہو سکتی ہے۔ پس خدا بیٹے ہی کی قربانی چاہتا ہے اونٹوں کی نہیں۔

جب حضرت ابراہیمؑ نے اپنا یہ خواب حضرت اسماعیلؑ سے بیان کر کے ان سے پوچھا اے بیٹے اب تم بتاؤ تمہاری کیا مرضی ہے تو حضرت اسماعیل علیہ السلام اگرچہ اس وقت نوعمر تھے تاہم نبوت کا نور ان کی پیشانی میں عیاں تھا وہ بولے اے ابا مجھے آپ نہایت صابر و شاکر پائیں گے۔ آپ بلا تامل اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کر ڈالیں۔

اکلوتے بیٹے کی رضامندی پر باپ اسے جنگل میں لے گیا اور وہاں پہنچ
کر بیٹے کو پیشانی کے بل لٹایا اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے گردن پر
چھری رکھ دی - قریب تھا کہ تن سے الگ ہو جاتی پردہ غیب سے ندا آئی
اے ابراہیم خواب کو تم نے سچ کر دکھایا تمہاری قربانی قبول ہوئی اب تم
اپنی آنکھوں سے پٹی کھول دو۔

اسلام کے معنی کامل اطاعت اور وفاداری کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے
اس حکم اور اطاعت کے عمل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل
علیہ السلام یعنی باپ بیٹا دونوں شامل ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے دین
کی تعلیمات کا اہم ترین جزو "اطاعت" قرار دیا ہے اور وہ اطاعت جس میں
اپنی رضا و رغبت کا پہلو بھی شامل ہو جیسا کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی
مثال سامنے ہے بلاشبہ دین اسلام ہے۔

دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ اسلام کوئی نیا مذہب نہیں ہے جسے
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کیا بلکہ یہ ابتدائے آفرینش سے اب تک
یہی پہلا اور آخری دین ہے جس کی آدم سے نوح اور نوح سے ابراہیم تک
تمام پیغمبران خدا دنیا کے لوگوں کو تعلیم دیتے چلے آئے وہ لوگ جو حضرت
ابراہیم علیہ السلام کی رسالت پر ایمان لائے اور آپ کے بتائے ہوئے طریقے پر چلے ان کا
نام حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسلام کی نسبت سے مسلمان رکھا - چنانچہ
ارشاد ہوتا ہے ۔ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ " انہوں
نے ہی (یعنی حضرت ابراہیم ہی نے) تمہارا نام بہت پہلے سے مسلمان رکھا

ہے - حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے - اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِیْفًا (سورہ النحل قرآن حکیم) بلا شبہ ابراہیم رض بہت بڑے مقتدا تھے اور وہ ایک طرف ہو کر اللہ کے فرمانبردار رہتے تھے -

قربانی کے اس عظیم واقعے سے کئی سال بعد پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دوسرے بیٹے حضرت اسحٰق علیہ السلام پیدا ہوئے جن کا لقب عمران تھا - وہ اپنے بڑے بھائی حضرت اسماعیل علیہ السلام سے نو برس چھوٹے تھے - پھر جب حضرت اسماعیل علیہ السلام جن کا لقب ذبیح اللہ تھا، ذرا بڑے ہوئے تو اپنے پدر گرامی قدر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ جن کا لقب خلیل اللہ تھا - اس عمارت کی تعمیر میں شریک ہوئے جسے عرب کی سرزمین پر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کے لئے دنیا میں اللہ تعالیٰ کا سب سے پہلا گھر یعنی بیت اللہ شریف (واقع مکہ معظمہ) کہا جاتا ہے اس موقع پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ - اے ہمارے رب ہم دونوں کو اپنا اطاعت گزار اور فرمانبردار (یعنی مسلمان) بنائیے اور ہماری اولاد سے بھی ایک ایسی جماعت بنا جو تیرے حکموں پر چلے (یعنی مسلمان رہے) رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَیُزَكِّیْهِمْ (سورہ بقر قرآن حکیم) اے ہمارے رب اس جماعت میں انہی میں سے ایک ایسا رسول بھی مبعوث فرما جو انہیں تیری آیات پڑھ کر سناتا رہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے

اور انہیں برائیوں سے پاک کرے۔

الغرض حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا کے سینکڑوں برس بعد جب ساری دنیا میں ایک خدا کا نام لینے والا کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا، اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا قبول کی اور آپ کے بڑے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں جسے بنی قریش کہتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔

نبوّت و رسالت

پردہ غیب سے ایسی باتوں کی تعلیم حاصل کرنا جو انسانی ذہن میں پیدا ہونے کی بجائے اس شخص کے دل پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل یا القا کی گئی ہوں جسے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی ہدایت اور اصلاح کے لئے اپنی مرضی سے منتخب فرماتا ہے اور اسے ایک ضابطہ حیات دے کر مبعوث کرتا ہے۔ نبوت و رسالت کا منصب کہلاتا ہے پس جسے اللہ تعالیٰ اس منصب پر فائز کرتا ہے وہ نبی و رسول کہلاتا ہے۔

اس کلام کا ماحصل یہ ہے کہ نبوت کوئی ایسی شے نہیں جسے کوئی شخص اپنی محنت اور کوشش سے حاصل کر سکے اور پھر اسے اپنے بعد اپنی اولاد کے حوالے کر جائے بلکہ نبوت و رسالت بجائے کسی شے ہونے کے ایک وہبی نعمت ہے جس کے وارث حقیقی صرف وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو نبوت و رسالت کی تعلیمات کو دل و جان سے قبول کرتے اور ان پر عمل کرتے ہیں اور

اس لحاظ سے کہ دنیا کے تمام لوگ کیا کالے کیا گورے، کیا چھوٹے کیا بڑے
سب کے سب ایک اللہ کے بندے اور ایک باپ حضرت آدم علیہ السلام
کے بیٹے ہیں لہٰذا عمل کی بنیاد پر ان کا نبوت و رسالت کی نعمت کا وارث
ہونا عین قرینِ انصاف ہے۔

اس کے برعکس اگر نبوت و رسالت کی نعمت بجائے وہبی ہونے کے
کسبی ہوتی تو اس کا ورثہ عمل کے بجائے نسل کی بنیاد پر قائم ہو سکتا تھا، مگر جیسا کہ
نبوت و رسالت کے مفہوم اور نبی و رسول کے منصب سے ظاہر ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی
ایک ایسی امانت ہے جس کا اللہ تعالیٰ کے بندوں تک پہنچانا ہر قیمت نبی و
رسول کا فرض منصبی ہے۔ لہٰذا تعلیمات نبوت و رسالت کے وارث بجا طور پر
وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو دل و جان سے ان پر عمل کرتے ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جن
کے روحانی طور پر انبیائے کرام باپ کہلاتے ہیں اور ان کی پیروی کرنے والے
ان کی آل (اولاد۔ امت) ہیں۔

بخلاف اس کے جو لوگ انبیائے کرام کی تعلیمات کے مخالف رہے
چاہے وہ خود انبیائے کرام کے اپنے ہی خون سے ہوں یا پرائے لوگ ہوں وہ
انبیائے کرام کی آل سے یکسر خارج ہیں جیسا کہ نوح علیہ السلام کے بیٹے کنعان
کو باوجود صلبی بیٹے ہونے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے چچا ابولہب
ابن عبدالمطلب کو باوجود حقیقی چچا ہونے کے تعلیمات نبوت کی مخالفت کر
کے باعث اللہ تعالیٰ نے ان کی آل سے نکال دیا۔

بفرض محال اگر رسولوں اور نبیوں کی آل (اولاد۔ امت) کو روحانی

رشتے کی بجائے جسمانی رشتے پر قیاس کیا جائے تو اس صورت میں خود آل کے مفہوم کو رسولوں اور نبیوں کے گھرانے تک ہی محدود کرنا پڑے گا چاہے وہ ایمان لائے ہوں یا اس سے محروم رہے ہوں۔ چنانچہ اگر اسی غلط مفروضے پر اصرار کیا جائے تو پھر یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ بنی اسرائیل جو آج تک گمراہ چلے آرہے ہیں سیدنا ابراہیم علیہ السلام ہی کی آل (اولاد۔ امت) ہیں اور عہد جاہلیت کے بنی قریش بھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے تین سو برس پہلے گمراہ ہوتے اور اسی گمراہی میں مبتلا رہ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پورے بیس برس تک مخالفت کرتے رہے، سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی آل (اولاد۔ امت) تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک میں بنی قریش کے چھوٹے بڑے کل دس قبیلے تھے جن کے نام یہ ہیں۔

۱۔ بنی تیم (اس سے حضرت ابوبکر صدیق تھے)

۲۔ بنی عدی (اس سے حضرت عمر فاروق تھے)

۳۔ بنی مخزوم (اس سے حضرت خالد بن ولید تھے۔

۴۔ بنی اسد

۵۔ بنی جمح

۶۔ بنی سہم۔

۷ - بنی عبد الدار

۸ - بنی نوفل

۹ - بنی ہاشم (اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم)

۱۰ - بنی امیہ (اس سے حضرت عثمان غنی۔ حضرت امیر معاویہ تھے)

ان سب میں آخر کے دو قبیلے بنی ہاشم اور بنی امیہ سارے عرب میں بڑی فضیلت و سیادت کے مالک ہوئے اور باقی کی آٹھ شاخیں بھی یہی اعزاز میں تقریب قریب یکساں تھیں۔ بنی ہاشم اور بنی امیہ۔ مکے کے سب سے پہلے قریشی سردار قصی ابن کلاب کے پوتے اور عبد مناف قریشی کے بیٹے ہیں۔ ہاشم بن عبد مناف قریشی سے ہاشمی خاندان پیدا ہوا اور ہاشم کے چھوٹے بھائی عبد الشمس بن عبد مناف قریشی کے بیٹے امیہ بن عبد الشمس سے اموی خاندان پیدا ہوا۔

بنی قریش

اسلام کے آنے کی برکت سے بنی قریش کو بھی اسلام کی تاریخ میں وہی فضیلت اور سیادت حاصل ہوئی جو کبھی انبیا کی تاریخ میں بنی اسرائیل کو حاصل تھی۔

بنی قریش، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بڑے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہے اور بنی اسرائیل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چھوٹے بیٹے حضرت اسحق علیہ السلام کے بیٹے حضرت یعقوب علیہ السلام الملقب اسرائیل یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے کی اولاد ہے۔ بنی اسرائیل کے نسب کا

شجرہ جاننے کے لئے یہ بات ذہن میں رکھیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا لقب خلیل اللہ، حضرت اسماعیل علیہ السلام کا لقب ذبیح اللہ اور حضرت اسحٰق علیہ السلام کا لقب عمران ہے اور بطور تعارف کے ان کی اولاد آل عمران کہلاتی ہے۔ حضرت اسحٰق کے بیٹوں میں جو نامور ہوئے اور خدا کے پیغمبر بنے وہ حضرت یعقوب علیہ السلام تھے جن کا لقب اسرائیل تھا۔ ان کے بارہ بیٹے تھے جن میں ایک بیٹے حضرت یوسف علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ نبی تھے اور باقی گیارہ بیٹوں میں ایک بیٹے کا نام یہودا تھا۔ یہودی جو آج تک اسلام اور مسلمانوں کے ازلی دشمن چلے آرہے ہیں اسی یہودا بن حضرت یعقوب علیہ السلام ہی کی اولاد ہیں۔ اب مختصراً شجرہ نسب یوں سمجھیں کہ آل ابراہیم کی ایک شاخ سے آل عمران ہوئے پھر آل عمران سے بنی اسرائیل اور بنی اسرائیل کی ایک شاخ سے یہودی ہوئے گویا نسلاً وہ سب کے سب ایک ہی باپ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے ہیں۔

بنی قریش اور بنی اسرائیل کے درمیان اب اگر کوئی فرق اور امتیاز ہے تو یہ ہے کہ بنی قریش اپنے جد گرامی قدر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس دین پر جس کا طغرائے امتیاز اللہ تعالیٰ کی مکمل اطاعت اور فرمانبرداری ہے (یعنی اسلام) برابر قائم رہے جس کا نام قرآن میں "دین حنیفہ" بیان کیا گیا ہے اس کے برعکس بنی اسرائیل ابتداء ہی سے اللہ تعالیٰ کے دین سے باغی اور سرکش چلے آرہے ہیں حتیٰ کہ اپنے حسب و نسب اور نسلی برتری کے جنون میں اللہ تعالیٰ کے بیٹے اور اس کے رشتہ دار ہونے کے مدعی بن بیٹھے اور پھر اسی جھوٹے دعوے

اور گھمنڈ میں اللہ تعالیٰ کے رسولوں اور نبیوں کو بے دریغ چیرتے پھاڑتے اور قتل کرتے رہے۔ ان کی سرکشی اور بغاوت کا اندازہ کچھ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ حضرت یعقوب سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک دنیا میں جس قدر نبی اور رسول آئے وہ سب کے سب انہی میں سے (یعنی اسحٰق علیہ السلام کی اولاد ہی سے) ہوئے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے آخری رسول تھے جو رسالت کی پاداش میں ان کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے اور بنی اسرائیل نے کبھی سیدھی راہ اختیار نہ کی۔ ہر چند اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ بات جتائی کہ اس نے انہیں سلطنت اور نبوت کی نعمت عطا کی مگر بنی اسرائیل نے کبھی توفیقِ خدا پر کان نہ دھرا حتیٰ کہ بنی اسرائیل نے خدا فراموشی، احسان ناشناسی اور سرکشی کا کچھ ایسا رنگ جمایا کہ اس کے اثر سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے تین سو برس گزر جانے کے بعد ان کی دیکھا دیکھی بنی قریش بھی گمراہ ہو گئے اور وہ بھی نسلی برتری کے بڑے بڑے دعوے کرنے لگے یعنی کہ وہ ساری دنیا کے مقابلے میں اپنے آپ کو فصیح (عرب کے لغوی معنی یہی ہیں) وہ اپنے مقابلے میں ساری دنیا کو عجمی یعنی گونگا جاننے لگے۔ اب عالم یہ تھا کہ تمام دنیا میں کہیں کوئی ایک خدا کا نام لینے والا نہ تھا۔ بنی اسرائیل خود پرست ہو گئے حضرت عیسیٰؑ کے ماننے والے تثلیث پرست (یعنی تین میں ایک اور ایک میں تین کو ماننے والے) روم و ایران کے لوگ آتش پرست اور ہندوستان کے لوگ بت پرست تھے۔

اسلام کے معنی خدائے واحد و بزرگ و برتر کی بلا چون و چرا کامل اطاعت کرنے کے ہیں اور جب لوگوں نے توحید پرستی کے بجائے خود پرستی، تثلیث

پرستی، آتش پرستی اور بت پرستی کو اپنا مذہب خیال کر لیا تو گویا اس آیہ قرآنی کے مطابق کہ اے نوح تیرا بیٹا (کنعان) جو ہمارا نافرمان ہے تیری آل میں نہیں اب حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دین بھی جس کی بنیاد اللہ تعالیٰ نے کامل اطاعت (اسلام) پر قائم کی موجود نہ رہا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آل بھی سوائے اہل ایمان کے جو حضرت ابراہیمؑ کے اصحاب تھے قائم نہ رہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی رسالت و نبوت کے ذریعے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین (اسلام) کو ان کے سینکڑوں برس گزر جانے کے بعد زندہ کیا اور جن لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول برحق جانا اور آنحضرت کی رسالت پر ایمان لائے انہیں وہی نام دیا گیا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے لفظ مسلمان سے موسوم کر کے دیا تھا اور بلا شبہ بقول آیہ قرآنی مسلمانوں کو یعنی اللہ تعالیٰ کے دین کی مکمل اطاعت کرنے والوں ہی کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آل (اولاد یا امت) کہا جاتا ہے جیسا کہ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے ملۃ ابیکم ابراھیم ھو سمّٰکم المسلمین - اے مسلمانو! حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی تمہارے باپ ہیں اور تمہارا مسلمان کے لفظ سے نام خود حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی نے رکھا ہے - اس آیہ قرآنی کی رو سے معلوم ہوا کہ درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی آل (امت اولاد) آل ابراہیمؑ (ملت ابراہیمی) اور یہ گویا اس بات کی بھی دلیل ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے جس دین کی اہل دنیا کو دعوت دی وہ کوئی نیا مذہب نہیں بلکہ یہ وہی دین ہے جس کی تعلیم کی ابتدا حضرت

آدم سے ہوئی۔ پھر سلسلہ بہ سلسلہ حضرت نوح اور حضرت ابراہیمؑ تک پہنچتے ہوئے نبی آخر الزمان پیغمبرِ اسلام حضور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی رسالت پر آکر مکمل ہو گئی۔ اب جیسے اسلام پر عمل کرنا ان تمام انبیائے کرام ہی کی تعلیمات پر عمل کرنا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ہوئے اسی طرح سے اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے اسوہ حسنہ کو مشعلِ راہ بنانا بھی تمام انبیائے کرام ہی کے طریقے پر چلنا ہے کیونکہ جیسے اسلام اللہ کی اطاعت اور اس کی رضا پہ راضی رہنے کے دین کا مکمل ضابطہ حیات پیش کرتا ہے ایسے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ میں دین اسلام کی تعلیمات پر عمل کرنے کا ہمیں کامل نمونہ ملتا ہے اور جیسے اب اسلام کے سوا کسی دوسرے مذہب پر چلنے کی ضرورت نہیں رہی۔ ایسے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ کے سوا جو عمل کا بہترین اور کامل ترین نمونہ ہے اب کسی دوسری شخصیت کی سیرت کو سامنے رکھنے کی گنجائش نہیں رہی

اب رہی یہ بات کہ مسلمانوں کو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی آل یعنی ان کے اصحاب کرام پر جو ایمان لائے، درود بھیجنے پر کیوں مکلف کیا گیا ہے تو اس کا مختصر طور سے جواب یہ ہے کہ اضافے کے ساتھ جو درود اب مسلمانوں کو ہر نماز میں پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم ہی کا مرتب کیا ہوا ہے اور اس کے ترتیب دیئے جانے کا سبب صرف اس بات کا اظہار کرنا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی حیاتِ مبارکہ میں اللہ کی مکمل اطاعت کرتے اور اس کی رضا پر راضی رہنے یعنی

(یعنی اسلام) کے جو لازوال نمونے پیش کیے ہیں وہ مسلمانوں کو (یعنی ملتِ ابراہیمی کو) ان سے ورثے میں حاصل ہوئے اور اسلام کے نام لیوا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے احسان کو تسلیم کرتے اور اس بات کے اعتراف کے طور پر درود و سلام بھیجتے ہیں کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بعثت محمدیہ سے کئی سو برس پہلے جو دعا کی وہ پوری ہوئی کہ اے اللہ مجھے اور میرے بیٹے اسماعیل، ہم دونوں کو اپنا اطاعت گذار اور فرماں بردار (یعنی مسلمان) بنا لیے لیکے اور اے اللہ ہماری اولاد میں انہی میں سے ایک رسول بھی مقرر فرما جو لوگوں کو تیری آیات پڑھ کر سنایا کرے اور انہیں آسمانی کتاب اور حکمت کی تعلیم دیا کرے اور انہیں برائیوں سے پاک بھی کرے۔

شہادت اویس قرنی

ہرم بن حیان سے ملاقات کے بعد پھر آپ گوشہ گمنامی میں کچھ ایسے گئے کہ جنگ صفین سے پہلے جو حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان برپا ہوئی، آپ کہیں دیکھنے میں نہیں آئے۔ تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑ کر جان دینے کی بڑی تمنا تھی اور آپ اس کے لئے اکثر دعا کیا کرتے تھے۔ آخر اللہ تعالیٰ نے آپ کی یہ آرزو پوری کر دی اور آپ ۳۷ھ میں حضرت علیؓ کی حمایت میں لڑ کر شہید ہوئے۔

یہاں جنگ صفین کے بارے میں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قدرے تفصیل بیان کر دی جائے اور اس کے برپا ہونے کا سبب واضح کر دیا جائے تاکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام کے ایثار و اخلاص پر کبھی کسی قسم کا کوئی شائبہ شبہ نہ کیا جا سکے۔ کیونکہ آنحضرت کے صحابہ جیسے تیسے بھی تھے، بارگاہ رسالت سے تربیت یافتہ، اسلام کے خدمت گزار اور ہم مسلمانوں کے محسن ضرور تھے، ان لوگوں کو اسلام اور مسلمانوں کی خدمت اور حفاظت کرنے کے لئے جو دشمنوں کا براہ راست سامنا کرنا پڑا۔ بایں سبب اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں وہ پسندیدہ ہو گئے جیسا کہ صحابہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک، قرآن حکیم میں خود ارشاد فرمایا ہے۔

رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ (سورہ المائدہ) اللہ تعالیٰ ان سے راضی (خوش ہوا) اور وہ (صحابہ) اس سے راضی ہو گئے۔ ہم میں سے آج کسی مسلمان کے لئے اس بات کی کوئی گنجائش نہیں کہ وہ اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی صحابی پر زبان طعن دراز کرے۔

درحقیقت مسلمانوں میں باہمی جنگ و جدل اور سر پھٹول کرنے کا دروازہ اس وقت کھلا جب نئے نئے مسلمان ہونے والے ان لوگوں نے اپنی شقاوت قلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خلیفہ اسلام حضرت عثمان غنیؓ کو نہایت بے دردی سے قتل کر ڈالا جو کوفہ، بصرہ اور مصر کے رہنے والے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی روح پرور اور ایمان افروز صحبتوں سے محروم رہنے کے باعث اسلامی تعلیمات کی روح سے ناواقف تھے۔

حضرت عثمان غنی کی شہادت کے بعد حضرت علی مرتضیٰ خلیفہ نہیں بننا چاہتے
تھے لیکن عراقیوں کے پر زور اصرار کے باعث آپ نے خلافت کی گراں ذمہ داریاں
اٹھانا قبول فرما لیا۔ علامہ ابن خلدون کی تحقیق کے مطابق حضرت علیؓ کو خلیفہ
ہو کر جو واقعات پیش آئے ان کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ جس وقت حضرت
عثمان غنی کوفے، بصرے اور مصر کے باغیوں کے ہاتھوں شہید ہوئے مدینہ منورہ
کے اکثر صحابہ اپنے کام کاج کی غرض سے مختلف شہروں میں پہلے ہی سے
گئے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے اس صورت میں جب حضرت علی خلیفہ ہوئے تو
آپ کی بیعت سے مدینے کے اکثر مسلمان الگ رہے بقیہ جتنے مسلمان اس
وقت مدینے میں تھے پھر ان میں بھی دو گروہ ہو گئے۔ ایک وہ تھے جنہوں نے
حضرت علیؓ کی بیعت کرنے میں پیش قدمی دکھائی اور بلا تامل بیعت کر لی
اور دوسرے وہ تھے جنہوں نے بیعت کرنے میں پس و پیش کیا اور اس بات
کے انتظار میں رہے کہ جب تمام مسلمان کسی ایک خلیفہ (امام) کی خلافت (امامت)
پر متفق الرائے ہو جائیں گے تو وہ بھی بیعت کر لیں گے۔

چنانچہ اسی نقطۂ نظر سے مدینے کے جن مسلمانوں نے حضرت علی مرتضیٰ
کی بیعت نہیں کی ان میں سعید سعد۔ ابن عمر۔ اسامہ بن زید۔ مغیرہ
بن شعبہ، عبداللہ بن سلام۔ قدامہ بن مظعون۔ ابی سعید خدری۔ کعب بن
عمر۔ کعب بن مالک۔ نعمان بن بشیر۔ حسان بن ثابت۔ مسلمہ بن مخلد
اور فضالہ بن عبید وغیرہ وغیرہ بڑے بڑے صحابہ رسول شامل ہیں۔ حضرت
عثمان غنی کی شہادت کے بعد جب وہ مسلمان بھی مدینے میں واپس آ گئے جو

تجارت کی غرض سے مختلف ملکوں میں گئے ہوئے تھے اور انہیں حضرت عثمان غنی کی شہادت کا پتہ چلا تو انہوں نے بھی حضرت علیؓ کی بیعت کرنے سے اس وقت تک کے لئے ہاتھ کھینچ لیا کہ جب تک وہ خلیفہ امام حضرت عثمان غنی کے خون کا اُن کے قاتلوں سے انتقام (قصاص) نہ لے لیں۔ گویا دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ ان حضرات نے حضرت عثمان غنی کے ناحق قتل کے قصاص کو حضرت علیؓ کی بیعت پر مقدم سمجھا اور اس بات کو برداشت کر لیا کہ مسلمان بیشک اس وقت تک بغیر کسی خلیفہ یا امام کے رہ جائیں کہ جب تک خلیفہ مظلوم حضرت عثمان غنی کا قصاص نہ لے لیا جائے اور مسلمانوں کے باہمی مشورے سے کسی کو خلیفہ یا امام منتخب نہ کر لیا جائے۔

اب دشواری یہ تھی کہ جن لوگوں نے حضرت عثمان غنی کو شہید کیا وہ حضرت علیؓ کی بیعت کر چکے تھے اور حضرت عثمان غنیؓ کی بیوہ سیّدہ نائلہ ایک باپردہ خاتون تھیں۔ وہ قاتلانِ عثمان میں سے کسی کو پہچاننے سے قاصر تھیں اور شرعی قاعدے کے مطابق حضرت عثمان غنیؓ کے قاتلوں کے خلاف کوئی شہادت نہیں ملتی تھی۔ بنا بریں حضرت علی بگڑے ہوئے حالات پر قابو نہ پا سکے اور حضرت عثمان غنی کا قصاص نہ لے سکے جس سے مسلمانوں میں ایک دوسرے کے خلاف غلط فہمی پیدا ہو گئی۔

چنانچہ یہ اسی بات کا اثر تھا کہ حضرت علیؓ کی مجبوریوں پر نظر کئے بغیر حضرت زبیرؓ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد بھائی) اور حضرت طلحہ (جن کا ایک ہاتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار کے تیروں

کی زد سے بچاتے بچاتے جنگ احد میں کٹ گیا) حضرت علیؓ کے پاس گئے اور جا کر کہا کہ وہ لوگ جو حضرت عثمان غنیؓ کے قتل میں شریک ہوتے اُن سے قصاص لینا از روئے شریعت لازم ہے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ تم لوگ جو کچھ کہہ رہے ہو میں برابر اس کی فکر میں ہوں۔ اس سے غافل نہیں مگر کیا کروں ایسی جماعت جس پر میرا بس نہیں چلتا میں سردست مجبور ہوں۔

ابھی یہ معاملہ چل ہی رہا تھا کہ حضرت علیؓ نے حضرت عثمان غنی کے زمانے کے تمام گورنروں خاص کر حضرت معاویہ کو جو ملک شام کے سالہا سال سے گورنر چلے آتے تھے، ان کے عہدے سے فی الفور ہٹائے جانے کا فیصلہ کیا۔ اگرچہ حضرت علیؓ کے بہی خواہوں نے آپ کو اس فیصلے سے روکنے کی کوشش کی۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ نے جو تدبیر و سیاست میں حضرت معاویہ کے ہم پلہ مانے جاتے تھے حضرت علیؓ سے جا کر یہ عرض کیا کہ ان حالات میں جبکہ خود صحابہ میں اپنے طور پر حضرت عثمان کا قصاص لینے کا خیال پیدا ہوتا جا رہا ہے آپ حضرت عثمان غنیؓ کے زمانے کے گورنروں کو فی الحال ان کے عہدوں سے نہ ہٹائیں۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ کے علاوہ حضرت علی کے منظور نظر، مشیر خاص، حقیقی چچیرے بھائی حضرت عبداللہ بن عباس نے بھی آ کر حضرت علیؓ کو سمجھایا کہ آپ اپنا فیصلہ واپس لے لیں اور کسی کو سردست ان کے مقام سے علیحدہ نہ کریں۔ تاوقتیکہ حالات پر قابو نہ پا لیں۔ لیکن حضرت علیؓ نے ان سب کا مشورہ قبول کرنے سے صاف انکار

کر دیا اور فرمایا کہ میں معاویہ کو تلوار سے سیدھا کر دوں گا۔

آخر کار حضرت علیؓ کی اس حکمت عملی کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کے دلوں میں حضرت علیؓ کے بارے میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ آپ قاتلانِ عثمان سے قصاص لینے میں خاموشی سے کام لے رہے ہیں۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے حضرت معاویہ کو جب ان کے عہدے سے معزول کیے جانے کا پروانہ بھیجا تو انہوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور حضرت علیؓ کو کھلم کھلا یہی الزام دیا کہ آپ قاتلانِ عثمانؓ سے قصاص لینے میں سکوت برت رہے ہیں اس لیے جب تک آپ قصاص نہیں لیں گے میں آپ کے فیصلے کو قبول نہیں کر سکتا۔

ادھر تو حالت یہ تھی کہ قصاص کا معاملہ زور پکڑ رہا تھا اور ادھر حضرت علیؓ اس خیال میں تھے کہ جب مدینے کے مسلمانوں نے میری بیعت کر لی تو اب تمام مسلمانوں پر میری بیعت لازم ہو گئی اور مدینے کے ان مسلمانوں پر بھی واجب ہو گئی جو مدینے سے باہر گئے ہوئے تھے حضرت علیؓ کا خیال تھا کہ جب امن و امان کی فضا پیدا ہو جائے گی اور حالات سازگار ہو جائیں گے اس وقت قاتلانِ عثمانؓ سے قصاص لے لیا جائے گا لیکن دوسرے صحابہ سمجھتے تھے کہ صحابہ میں اکثر اربابِ حل و عقد مختلف مقامات پر پھیلے ہوئے ہیں اور بہت کم صحابہ ایسے ہیں جو اس وقت موجود ہیں۔ اس لیے یہ بیعت ابھی نامکمل ہے۔ ان کا خیال تھا کہ پہلے حضرت عثمان غنیؓ کے خون کا بدلہ لے لیا جائے اس کے بعد سب مل کر باتفاق رائے خلیفہ (امام) کا انتخاب کر لیں گے

چنانچہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ - حضرت زبیر - حضرت طلحہ اور ان کے بیٹے حضرت محمد، سعد، حضرت سعید، حضرت نعمان بن بشیر، حضرت معاویہ بن خدیج اور حضرت معاویہ بن ابو سفیان وغیرہ صحابہ اسی خیال کے پیرو تھے اور خلافت کی بیعت سے پہلے حضرت عثمان غنی، خلیفہ اسلام کے ناحق خون کا قصاص لینا ضروری سمجھتے تھے۔

حضرت معاویہ بڑے صاحب تدبیر و سیاست تھے اور اسی طاقت کے بل بوتے پر ملک شام کے بیس سال سے نہایت کامیاب، گورنر چلے آتے تھے حتیٰ کہ روم کے عیسائی جن کی سلطنت کی سرحدیں پاس پاس تھیں، ان کے نام ہی سے لرزہ براندام رہتے تھے۔ بالکل اسی زمانے میں جب حضرت علیؓ نے حضرت معاویہ کو شام کی ولایت سے معزول کر کے اپنی بیعت کرنے کا خط لکھا اور ساتھ ہی حضرت سہل بن حنیف کو ان کی جگہ والی بنا کر شام بھیج دیا حضرت معاویہ نے مدینہ منورہ سے اپنے چچیرے بھائی خلیفہ اسلام حضرت عثمان بن غنی کا خون آلود پیراہن اور ان کی بیوہ حضرت نائلہ کی کٹی ہوئی انگلیاں منگوا کر دمشق کی جامع مسجد کے منبر پہ آویزاں کروا رکھی تھیں شام کے مسلمانوں کے جذبات ان چیزوں کے دیکھنے سے بھڑک اٹھے، وہ انہیں دیکھنے کے لئے جوق در جوق آتے اور دیکھ دیکھ کر زار و قطار روتے تھے

حضرت معاویہ نے یہ منظر دکھانے کے لئے حضرت علیؓ کے قاصد کو چند روز کے لئے اپنے پاس روک لیا۔ پھر اس کے بعد ایک سادہ لفافہ دے کر حضرت علیؓ کے پاس واپس بھیج دیا۔ حضرت سہیل بن حنیف جنہوں

حضرت علیؓ نے حضرت معاویہ کی جگہ شام کا گورنر بنا کر بھیجا تھا۔ وہ پہلے ہی شام کی سرحد تبوک سے واپس کر دیئے گئے حضرت معاویہ نے انہیں شام کے حدود میں داخل نہیں ہونے دیا، اب جو قاصد کے واپس آنے پر حضرت علیؓ نے لفافہ کھول کر دیکھا اور اس میں کچھ نہ پایا تو سمجھ گئے کہ حضرت معاویہ نے ان کا حکم ماننے سے انکار کر دیا ہے: حضرت علیؓ نے اپنے قاصد سے شام کے حالات دریافت فرمائے، اس نے عرض کیا کہ شام کے ساٹھ ہزار بزرگ مسلمان حضرت عثمان غنی کے پیراہن پر گریہ کناں ہیں اور ان کے خون کا قصاص لینے کا عزم کر چکے ہیں۔ یہ سن کر حضرت علیؓ نے فرمایا اے خدا میں عثمانؓ کے خون سے بری ہوں۔

ان واقعات کے سامنے آنے سے اب حضرت علیؓ کو حالات کا مکمل اندازہ ہو گیا اور آپ نے حضرت معاویہ سے لڑنے کی تیاریاں شروع کر دیں اور یہ پہلا موقع تھا کہ وہ مسلمان جو کفر و باطل کے استیصال کے لئے سربکف ہو کر میدانِ جنگ میں آتے تھے، اب وہ آپس ہی میں کٹ مرنے پر آمادہ ہو گئے اور یہ بات چونکہ نامناسب تھی اس لئے اکثر صحابہ اس جنگ میں شریک ہونے کا وہ لوگ فیصلہ نہ کر سکے۔ بہت سے اصحاب نے مسلمانوں کے درمیان باہمی جنگ کی مخالفت کی یا کم سے کم وہ غیر جانبدار رہے جیسا کہ حضرت سعد بن وقاص کے طرزِ عمل سے ظاہر ہے کہ انہوں نے غیر جانبداری کا پہلو اختیار کیا اور جنگ میں حصہ نہیں لیا۔

حضرت سعد بن وقاص رشتے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے

ماموں لگتے تھے۔ حضرت علیؓ نے آپ سے پوچھا کہ مجھے آپ کے بارے میں ناپسندیدہ خبریں ملی ہیں کیا یہ درست ہے۔ انہوں نے حضرت علیؓ سے جواباً فرمایا کہ اگر آپ اس جنگ میں میری شرکت کے طالب ہیں تو مجھے ایک ایسی تلوار لا دیجئے جس سے کافر اور مسلمان کے درمیان امتیاز پیدا ہو سکے۔ کچھ ایسا ہی جواب حضرت عبداللہ بن عمر فاروقؓ کا بھی تھا۔ انہوں نے حضرت علیؓ سے کہا کہ آپ مجھے کسی ایسی شے میں شریک ہونے پر مجبور نہ کریں جس کے باطل ہونے کا میں اب تک فیصلہ نہیں کر سکا۔

حضرت اسامہ اس باپ حضرت زید کے بیٹے تھے جن کی محبت اور خدمت گزاری دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیا تھا حتیٰ کہ ان کی شادی بھی خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے کی یہ اسامہ انہی زید بن حارثہ کے بیٹے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے جس قدر محبت تھی، ان کا اندازہ کچھ اس بات سے کیجئے کہ بچپن میں ان کی ناک خود اپنے دستِ مبارک سے پاک کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ اگر اسامہ بیٹی ہوتی تو میں اسے خود اپنے ہاتھ سے زیور پہناتا۔

حضرت علیؓ نے جب حضرت اسامہ بن زید سے پوچھا کہ تم کہو تمہاری کیا مرضی ہے تو انہوں نے عرض کیا کہ آپ مجھے اس جنگ میں شریک ہونے سے معاف ہی رکھیں تو اچھا ہے کیونکہ میں یہ فیصلہ کر چکا ہوں کہ کلمہ شہادت پڑھنے والوں سے جنگ نہ کروں گا۔ ایک اور صحابی حضرت محمد بن مسلمہ نے بھی یہی جواب دیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے

یہ

ارشاد فرمایا تھا کہ میں اپنی تلوار کو مشرکوں کے مقابلہ میں استعمال کروں اور جب خدانخواستہ مسلمانوں سے لڑنے کا موقع آجائے تو اسے کوہِ احد کے پتھر پر پٹخ کر توڑ دوں، چنانچہ میں نے اسے کل توڑ دیا ہے۔

مدینہ منورہ میں صحابہ کرام کے درمیان ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ حضرت علی سے اجازت لے کر حضرت طلحہ اور حضرت زبیر مدینے سے مکے چلے گئے۔ یہاں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ جو حج کے لئے آئی ہوئی تھیں پہلے سے موجود تھیں۔ ان حضرات نے انہیں حضرت عثمان غنیؓ کے باغیوں کے ہاتھوں دردناک شہادت کے حالات سے آگاہ کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قاتلانِ عثمان سے قصاص لینے کے لئے ہزاروں مسلمان حضرت عائشہ صدیقہ کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔

الغرض مسلمانوں کے لئے یہ بڑا نازک موقع تھا۔ ایک طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوب بیوی حضرت عائشہ صدیقہ تھیں اور دوسری طرف خلیفہ برحق حضرت علی مرتضیٰ تھے جن کی پرورش و تربیت ہی دامن رسالت میں ہوئی تھی۔ یہ روزِ بد جو کوفے، بصرے اور مصر کے ان باغیوں کی بدولت مسلمانوں کو دیکھنا پڑا جو اسلام کی تعلیمات سے ناواقف تھے تو گویا ماں اور بیٹے کے درمیان یہ جنگ مسلمانوں کے لئے نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن کے مصداق تھی۔ مسلمان اس روز بقول طبری کے اسلام پر اتنا روئے کہ اس سے پہلے کبھی نہ روئے تھے۔

المختصر حضرت معاویہ کی جنگ سے پہلے حضرت عائشہ کے لشکر سے

جنگ ہو گئی۔ اس موقع پر حضرت عائشہ نے جو تقریر فرمائی تھی اس کا خلاصہ یہ ہے۔ بخدا میرے رتبے کے لوگ اپنے ارادے کو نہیں چھپاتے اور نہ کوئی ماں اپنے بیٹوں سے کوئی حال چھپاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جھگڑالو طبیعت کے لوگوں نے رسولِ خدا کے حرم (مدینہ منورہ) پر حملہ کیا اور اس میں فتنہ و فساد پیدا کر کے اور فتنہ پردازوں کی حمایت کر کے اپنے آپ کو خدا، اور خدا کے رسولؐ کی لعنت کا مستحق بنا لیا ہے۔ انہوں نے (یعنی باغیوں نے) بلا وجہ اور بے گناہ مسلمانوں کے امام حضرت عثمان غنی کو شہید کیا، معصوم خونریزی کی۔ اس مال کو لوٹ لیا جو حرام تھا۔ اس کے لئے ان لوگوں نے مقدس شہر (مدینہ منورہ) اور مقدس مہینے (حج) کی بے حرمتی کی۔ لوگوں کی آبروریزی کی۔ مسلمانوں کو مارا۔ ان کے گھروں میں زبردستی گھس گئے جو انہیں اپنے پاس رکھنے کے ذمہ دار نہ تھے۔ انہوں نے ان مسلمانوں کو نقصان پہنچایا ہے جن میں نہ ان سے بچنے کی طاقت ہے نہ محفوظ رہنے کی اور نہ وہ اب ان سے محفوظ ہیں۔

حضرت عائشہ صدیقہ نے اپنے لشکر کی غرض و غایت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ میں اپنے ہمراہ مسلمانوں کا لشکر لے کر اس لئے نکلی ہوں کہ لوگوں کو بتاؤں کہ ان (باغیوں) سے مسلمانوں کو کیا نقصان پہنچ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لا خیر فی کثیر من نجواھم الا من امر بصداقۃ او معروف او اصلاح بین الناس یعنی لوگوں کی سرگوشیوں میں کوئی بھلائی نہیں لیکن یہ کہ خیرات

اور عام نیکی اور بھلائی کا حکم دیں اور لوگوں کی اصلاح کریں۔ ہم اصلاح کے لئے اٹھے ہیں جس کا خدا اور اس کے رسولؐ نے ہمیں حکم دیا ہے یہی ہمارا وہ نیک مقصد ہے جس پر ہم تمہیں آمادہ کر رہے ہیں اور جس کی برائی سے تمہیں روکنا چاہتے ہیں۔

یہ موقع خود حضرت علیؑ کے لئے بھی کسی طرح کم نازک نہ تھا وہ اگر خاموش رہتے ہیں تو اس سے خلافت کے نظام پر اثر پڑتا ہے اور اگر فوج لے کر نکلتے ہیں تو حضرت عائشہ صدیقہ یعنی ماں سے جنگ و جدل ہوتا ہے لیکن امن و امان کے قیام کے لئے یہ بے حد ضروری تھا دوسرے وہ سمجھتے تھے کہ چند فتنہ پرداز حضرت عائشہ صدیقہؓ کے لشکر میں شامل ہو گئے اس لئے انہیں مجبوراً میدانِ جنگ میں اترنا پڑا۔

درحقیقت بگڑے ہوئے احوال نے پیچیدگی پیدا کر کے جو نیا رخ اختیار کیا۔ اس سے اب یہ مسئلہ ایک آدمی، یا چند آدمیوں، یا کسی ایک جماعت کے قتل کا نہیں رہا جس نے حضرت عثمان غنیؓ کو شہید کیا بلکہ حالات کی ناسازگاری اور بدامنی کے باعث تمام مسلمانوں کا سوال بن گیا۔ حضرت طلحہ اور حضرت زبیر کو قصاص لینے پر اصرار تھا اور حضرت علیؑ کو حالات کے سازگار ہونے کا انتظار تھا۔ آخر جب غلط فہمیاں حد سے بڑھ گیئں تلواریں میان سے نکل آئیں۔

درحقیقت یہ غلط فہمی صرف انہی لوگوں نے پھیلائی تھی جو حضرت عثمان غنی کے قاتل تھے اور وہ دل سے نہیں چاہتے تھے کہ مسلمانوں میں

باہمی اتفاق پیدا ہو، اس بات کا قطعی ثبوت اس واقعے سے بخوبی مل سکتا ہے
کہ جنگ سے پہلے حضرت علیؓ نے جنگ کو روکنے کی پوری کوشش فرمائی اور
کوفے کے ایک بزرگ صحابی قعقاع بن عمرو کو حضرت طلحہ اور حضرت زبیر
اور حضرت عائشہؓ کے پاس بھیجا اور انہوں نے ان سے آ کر کہا کہ اگر آپ
حضرات کا مقصد یہ ہے کہ احوال کی اصلاح ہو جائے اور حضرت عثمان غنیؓ
کے خون کا قصاص لیا جائے تو خاطر جمع رکھئے۔ حالات کے پرسکون ہوتے
ہی قصاص ضرور لے لیا جائے گا۔ پھر انہوں نے حضرت طلحہ اور حضرت زبیر
کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ آپ حضرات جس طرح پہلے امت محابہ کے
لئے خیر و عافیت اور امن کی کلید تھے، اسی طرح آج بھی کلید ہیں اور مسلمانوں
کو ہرگز سخت آزمائش میں نہ ڈالیں۔ ورنہ یاد رکھیں یہ آزمائش ہم دونوں
کو تباہ و برباد کر ڈالے گی۔

حضرت قعقاع بن عمرو کی یہ باتیں اس قدر موثر اور معقول تھیں کہ
حضرت عائشہؓ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ تینوں ان پر متفق ہو گئے۔ جب
قعقاع بن عمرو نے واپس آ کر حضرت علیؓ کو یہ مژدہ سنایا تو وہ بے حد خوش
ہوئے اور مخلص مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت مصالحت کرنے کے لئے
تیار ہو گئی اور جب حضرت علیؓ نے مسلمانوں کے سامنے تقریر کرتے
ہوئے یہ کہا کہ اب حالات اصلاح پکڑتے جا رہے ہیں اور وہ لوگ
جو حضرت عثمان غنی کے قتل میں شریک ہوئے نہ ہم سے کوئی توقع
رکھیں اور نہ ہمارا ساتھ دیں تو فتنہ پرداز کوفے، بصرے اور مصر سے آئے تھے،

آپس میں کہنے لگے کہ اب ہماری خیر نہیں ہم میں سے کوئی زندہ نہ بچ سکے گا اس لئے بہتر یہ ہے کہ سب مل کر علیؓ کو بھی عثمانؓ کے پاس پہنچا دیں تاکہ قصہ ہی ختم ہو جائے۔

لیکن بقول طبری کے اس رائے پر لوگوں میں اختلاف پیدا ہو گیا اور ابن السوداء کی تجویز پر یہ طے پایا کہ اس سے پہلے علی و طلحہ اور زبیر کو سر بجوڑ کر بیٹھ کر غور و فکر کرنے کا موقع ملے فوراً جنگ کا آغاز کر دیا جائے اور مصالحت کی نوبت ہی نہ آنے پائے اور جب ایک مرتبہ جنگ چھڑ جائے تو اس کے شعلے اس قدر بلند ہو جائیں گے تو اپنے بچاؤ کے لئے حضرت علیؓ بھی اپنے آپ جنگ کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

بالآخر فتنہ پردازوں کی ترکیب کارگر ہوئی اور میدان کارزار گرم ہو گیا اس کا آغاز یوں ہوا کہ فتنہ پردازوں نے دونوں گروہوں کو مصالحت پر آمادہ پا کر چپکے سے رات کی تاریکی میں دونوں فوجوں پر حملہ کر دیا اور اس غیر متوقع حملے سے دونوں فوجیں ہراساں ہو گئیں اور اپنی حفاظت اور دفاع کے لئے دونوں میں جنگ چھڑ گئی۔

حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ چونکہ مصالحت پر آمادہ ہو چکے تھے اور وہ دونوں حضرت علیؓ سے اس گفتگو کے بعد جو انہوں نے ان سے کی تھی مطمئن ہو چکے تھے اس لئے وہ نہیں لڑنا چاہتے تھے مگر فتنہ پردازوں نے جب کوئی موقع دیئے بغیر جنگ کا آغاز کر دیا تو جنگ کی آگ میں وہ بھی مجبوراً کود پڑے۔ مگر عین لڑائی کے میدان میں حضرت علیؓ کی جب

ان پر نظر پڑ گئی تو لڑائی سے ہاتھ کھینچ لیا۔ فتنہ پردازوں نے جب یہ رنگ دیکھا تو دونوں کو شہید کر دیا۔ حضرت زبیر ایک فتنہ پرداز سبائی عمرو بن جرموز کے ہاتھوں اس وقت شہید ہوئے جب آپ نماز پڑھ رہے تھے عمرو بن جرموز جب حضرت زبیر کا سر، گھوڑا اور تلوار اور زرہ لے کر بڑی مسرت و شادمانی کے ساتھ حضرت علیؓ کے پاس پہنچا تو آپ نے فرمایا اے ابن صفیہ کے قاتل! تجھے دوزخ کی بشارت ہو۔

حضرت علیؓ کی زبان مبارک سے یہ بات سن کر عمرو بن جرموز بولا کیا میری جان نثاری کا یہی صلہ ہے کہ میں تو آپ کے دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتاروں اور آپ مجھے دوزخ کی بشارت دیں۔ حضرت علیؓ نے حضرت زبیر کی تلوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عمرو بن جرموز سے فرمایا تو نے آج اس شخص کو قتل کیا ہے جس کی تلوار نے کئی بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ انور سے غم و اندوہ اور حزن و ملال کے آثار دور کئے ہیں۔

اسی طرح حضرت طلحہؓ بھی جام شہادت نوش کر گئے وہ حضرت علیؓ کی زبان مبارک سے ایک حدیث نبوی سن کر میدان جنگ سے واپس جا رہے تھے کہ ایک شقی القلب نے انہیں واپس جاتے دیکھ کر ایسا تیر کھینچ مارا کہ ایک ہی تیر میں واصل بحق ہو گئے۔ حضرت زبیر اور حضرت طلحہ کی شہادت کے بعد لڑائی کا زور بندھ گیا اور حضرت عائشہ صدیقہ کے محمل پر ہر طرف سے تیروں کی بارش ہونے لگی حتیٰ کہ اس کی حفاظت

میں دو ہزار جانیں قربان ہو گئیں اگرچہ اس وقت حضرت عائشہ صدیقہ کے اونٹ کی مہار پکڑنا موت کے منہ میں جانے کے مترادف تھا۔ تاہم جاں نثاروں کا تانتا نہ ٹوٹتا تھا جیسے ہی ایک گرتا تھا فوراً دوسرا شخص اس کی جگہ لے لیتا تھا مخالف لوگوں نے جب یہ صورت دیکھی کہ چالیس آدمیوں کو یہ سعادت حاصل ہو چکی ہے اور جب تک یہ اونٹ درمیان میں رہے گا لڑائی بند نہ ہو گی تو مخالف گروہ کے چند آدمیوں نے اونٹ کے پاؤں زخمی کر کے اسے نیچے گرا دیا اور اونٹ کے گرتے ہی لڑائی کا رنگ بالکل ہی بدل گیا۔

عربی زبان میں اونٹ کو جمل کہتے ہیں۔ چونکہ اس جنگ میں حضرت عائشہ رض اونٹ پر سوار ہو کر محمل میں تشریف لائی تھیں اس لئے یادگار کے طور پر اسے جنگ جمل کہا جاتا ہے۔ جنگ کے بعد حضرت علی نے حضرت عائشہ صدیقہ کو نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ مدینہ منورہ پہنچا دیا اور اپنے لشکر میں یہ اعلان فرمایا کہ اب کسی بھاگنے والے کا تعاقب کیا جائے نہ کسی کو زخمی کیا جائے نہ کسی کا مال و اسباب لوٹا جائے اور جو شخص ہتھیار ڈال دے یا اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے اس کے لئے امان ہے۔

المختصر جنگ جمل کے بعد پھر حضرت معاویہ کے درمیان معرکہ کارزار گرم ہوا۔ حضرت علی نے اس مرحلے پر بھی ہر ممکن کوشش کی جسے آپ کے لشکر کے فتنہ پردازوں نے ناکام کر دیا اور آخر میں آپ کے لشکر کے لوگوں کی نافرمانی اور بے وفائی نے یہ ثابت کر دیا کہ حضرت علی ابن ابی طالب

سچ فرماتے تھے کہ جب تک بدامنی دور نہ ہو جائے ان کے لئے حضرت عثمان غنیؓ کا قصاص لینا مشکل ہے۔

الغرض کوفہ، بصرہ اور مصر کے فتنہ پردازوں کی بدولت جنگ کی جو آگ دیارِ حرم (مدینہ منورہ) میں بھڑکی تھی اس سے جنگ جمل میں تیرہ ہزار مسلمان اور صفین کے مقام پر جو حضرت معاویہؓ سے جنگ ہوئی اس میں ستر ہزار مسلمان۔ پھر اس کے بعد جب حضرت علیؓ کو خود اپنے لشکر کے باغیوں (خارجیوں) سے لڑنا پڑا۔ تو اس میں پچیس سو مسلمان کام آئے۔ مختصر طور سے یہ سمجھئے کہ حضرت علیؓ کی بیعت سے پانچ مہینے اور اکیس روز بعد جنگِ جمل کے نام سے جو پہلی معرکہ آرائی ہوئیؓ اس سے جنگ صفین تک جو پورے سات مہینے اور تیرہ روز بعد لڑی گئی۔ پھر جنگ صفین سے ایک سال دو مہینے بعد نہروان کی جنگ تک جو حضرت علیؓ نے خود اپنے لشکر کے باغیوں اور نافرمانوں سے کی تھی مجموعی طور پر اسّی ہزار مسلمان آپس میں کٹ مرے اور خیال کیجئے کہ ان لڑائیوں میں کتنی بے شمار عورتیں بیوہ ہو گئیں اور لاکھوں بچے یتیم ہو گئے۔

مقصد کہنے کا یہ ہے کہ اب ہمیں اپنے ماضی کے واقعات سے عبرت پکڑنی چاہیئے اور آپس کے تمام اختلافات مٹا کر ایک ہو جانا چاہئے کیونکہ ہم سب کا خدا، ایک رسول، ایک کتاب ایک اور ایمان ایک ہے۔ یہی وہ اصل مقصد ہے جس کی صوفیائے کرام اور علمائے عظام آج تک مسلمانوں میں تبلیغ کرتے چلے آرہے ہیں۔

حضرت علی رضؓ ابن ابی طالب
کی
رائے

فلسفہ تاریخ کے بانی علامہ ابن خلدون المتوفی سنہ ۸۰۸ھ اپنی مشہور عالم کتاب "مقدمہ" ابن خلدون میں طبری المتوفی سنہ ۳۱۰ھ اور دوسرے مورخین کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ کسی شخص نے حضرت علی ابن ابی طالب سے دریافت کیا کہ وہ مسلمان جو صفین اور جمل کی لڑائیوں میں مارے گئے ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے یعنی ان میں سے ناجی کون ہیں اور قابلِ گرفت کون ہے؟ آپ نے فرمایا خدا کی قسم ان لڑائیوں میں جو بھی مرا وہ جنتی ہے بشرطیکہ اس کا دل پاک ہو۔

درحقیقت یہ لڑائیاں جو مسلمانوں میں برپا ہوئیں اُن ایسے نئے نئے مسلمان ہونے والوں کی دینی بصیرت کی کمی کا نتیجہ تھیں جو اسلام کا غلبہ دیکھ کر مسلمان ہوئے تھے اور ان لوگوں کی طرف سے ان کی پشت پناہی کی

کی گئی تھی جو مسلمان بننے کا دھوکہ دے کر اسلام اور مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے کے در پے تھے ان میں ایک تو وہ لوگ تھے جو یہودی تھے اور دوسرے عجمی تھے اور چاہتے تھے کہ جیسے تیسے بن پڑے عرب کے مسلمانوں کو ایران کے فتح کرنے کا مزہ چکھائیں

ایران کی فتح حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں واقع ہوئی تھی۔ عجم کے وہ لوگ جو عربوں کے ہاتھوں اپنے گئے ہوئے اقتدار کو حاصل کرنے کی تدبیریں کر رہے تھے جلال فاروقی کے سامنے بے بس ہو گئے، البتہ جب حضرت عمر فاروقؓ کی شہادت کے بعد حضرت عثمان غنیؓ کی خلافت کا زمانہ آیا تو ان کے مزاج کی نرمی سے فائدہ اٹھا کر اسلام اور مسلمانوں کی راہ سے فائدہ اٹھانے کا انہیں موقع مل گیا اور وہ خلیفۂ اسلام حضرت عثمان غنی سے بغاوت اور سرکشی میں اس حد تک بڑھے کہ انہیں دن دھاڑے بڑی بے دردی سے شہید کر ڈالا۔

حضرت عثمان غنی کی شہادت کے بعد عراقیوں کے اصرار سے مجبور ہو کر حضرت علی ابن ابی طالب خلیفہ بنے مگر آپ کا تمام تر وقت مسلمانوں کے باہمی لڑائی جھگڑوں ہی میں گزر گیا اور آپ ایک دن بھی امن و امان سکون اور چین سے نہ بیٹھ سکے۔ انہی دنوں میں حضرت علیؓ سے ایک شخص نے عرض کیا یا امیر المومنین اس کی کیا وجہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت کا زمانہ تو نہایت امن و امان سے گزر گیا اور ان سے کسی نے اختلاف نہیں کیا۔ اس کے برعکس ایک

آپ ہیں کہ جب سے خلیفہ ہوئے ہیں تب سے اب تک ایک دن بھی آپ کو آرام و راحت میسر نہیں آیا۔ حضرت علی ابن ابی طالب نے جواب میں فرمایا اس کا سبب یہ ہے کہ ابوبکرؓ و عمرؓ مجھ جیسے لوگوں پر والی ہوئے اور میں تم جیسے لوگوں پر والی بنایا گیا ہوں۔

حضرت علی مرتضیٰ کے اس قول سے علامہ ابن خلدون یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ آپ کے قول کا مطلب یہ تھا کہ اب جو آئے دن جنگ و جدل ہوتا ہے وہ سبب ہے اس بات کا کہ عجمی نومسلموں کی دینی بصیرت کے فقدان کے باعث مسلمانوں کی سلطنت میں دین کے جذبات کم ہو گئے ہیں۔ یعنی وہ اسلام کی روح کو نہیں سمجھتے۔ بلاشبہ یہ ایسے ہی لوگ تھے جن کے ہاتھوں خلیفہ اسلام حضرت عثمان غنی شہید ہوئے

اسلام کے ابتدائی زمانوں میں وہ جنگیں جو صحابہ یا تابعین کے درمیان برپا ہوئیں علامہ ابن خلدونؒ ان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جن اغراض و مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے یہ باہمی جنگ جدل ہوا چونکہ اس میں تمام تر باتیں دینی تھیں، دنیاوی نہ تھیں اس لئے اسے مسلمانوں کی ایک اجتہادی غلطی تو کہا جا سکتا ہے لیکن یہ ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ ان میں ایک فریق ناجی ہے اور دوسرا گنہگار اور بقول حضرت علی مرتضیٰ! ان جنگوں میں حصہ لینے والا ہر وہ شخص جس کا دل دنیا کی خواہشات سے پاک تھا بلاشبہ جنتی ہے اور اسی بات پہ تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔

ختم شد

ضمیمہ

آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم

جیسا کہ ہم پچھلے صفحات میں بتا چکے ہیں کہ آل محمدؐ کے باب میں تین خیالات پائے جاتے ہیں جن میں پہلا خیال یہ ہے کہ آنحضرتؐ کی ذات گرامی، دختر رسول مقبولؐ سیدہ فاطمۃ الزہراؓ اور داماد رسولؐ سیدنا علی ابن ابی طالب، سبطین رسول، سیدنا حسن ابن علیؓ، سیدنا حسین ابن علیؓ کا وجود مسعود آل محمدؐ سے عبارت ہے۔ یہ خیال جن لوگوں نے پیش کیا ہے وہ اس کی بنیاد تیسرے پارہ کی سورہ مبارکہ کی حسب ذیل آیات پر قائم کرتے ہیں

فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ ۝

پھر جو کوئی جھگڑا کرے آپ سے، اس قصّے میں جبکہ آپ کے پاس سچی خبر آچکی ہے تو کہہ دیجئے کہ آؤ ہم بلالیں اپنے بیٹے تمہارے بیٹے، اپنی عورتیں، اپنی جان اور تمہاری جان، پھر التجا کریں ہم سب اور جو لوگ جھوٹے ہیں ان پر اللہ کی لعنت کریں (سورۂ آل عمران، قرآن حکیم)

حجتہ الاسلام شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن قدس اللہ سرہٗ ان آیات کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں لغت العرب میں ابن اپنے بیٹے کو کہتے ہیں نواسہ ابن البنت کہلاتا ہے قرآن حکیم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت فرمایا گیا کہ آپ کسی مرد کے باپ نہیں (جیسا کہ قرآن حکیم کے بائیسویں پارے سورہ الاحزاب میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِنْ رِجَالِكُمْ وَلَٰكِنْ رَسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ ۗ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ۝ تم مردوں میں سے محمدؐ کسی مرد کے باپ نہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے رسول اور تمام نبیوں پر مہر ہیں اور اللہ تعالیٰ سب چیزوں کا جاننے والا ہے، لہذا کسی مرد کو آپ کا بیٹا کہنا آیت کے خلاف ہوگا۔ اگر حضرات حسن و حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو آنحضرتؐ نے اپنا بیٹا فرمایا تو محبت کے اظہار کے لئے یہ بات مجازی حیثیت رکھتی ہے، حقیقی نہیں کیونکہ بیٹا تو وہی ہو سکتا ہے جو صلبی ہو)

لفظ نساء جمع ہے جب یہ لفظ کسی کی طرف منسوب ہوتا ہے تو اس سے اس کی بیوی مراد ہوتی ہے

سورۂ احزاب میں ہے: یا نساء النبی اے نبی کی بیویو۔ البتہ نساء کے لفظ سے فاطمہؓ مراد لینا کسی طرح صحیح نہیں
زبان میں بیٹی کو عورت نہیں کہا جاتا۔ اس وقت سیدۃ النساء حضرت فاطمہؓ کے سوا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی
اولادِ اطہار زندہ موجود نہیں تھی اس لئے آپ نے حکم مباہلہ کی دعوت دینے سے پہلے خاتونِ جنت کو اور ان کے دونوں بیٹوں کو
اس غرض سے ساتھ لے لیا کہ فریقِ مقابل پر مباہلہ کیلئے آپ کی کامل آمادگی پوری طرح روشن ہو جائے اور یہ سمجھ کر محض
دھمکی اور بازی [illegible] ہے۔ حضرت فاطمہ اور حسنین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا ساتھ جانا بلا اختلاف صحیح روایات میں مذکور ہے لیکن
حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی ہمراہی اکثر صحیح روایات میں نہیں۔ ابن جریر طبری کا بیان ہے کہ ہم سے ابن حمید نے بیان کیا کہ
جریر نے مغیرہ سے دریافت کیا کہ لوگ اہل نجران کے مباہلے میں روایت کرتے ہیں کہ علیؓ بھی آنحضرتؐ کے ہمراہ تھے تو انہوں نے
کہا کہ علامہ شعبی نے حضرت علیؓ کا ذکر نہیں کیا۔ حوالے کے لئے دیکھئے تفسیر طبری جلد ۳ ص ۱۹۲۔

تفسیر طبری میں ایک روایت قتادہ سے منقول ہے اس میں بھی حضرت علیؓ کا کوئی ذکر نہیں بعض لوگوں کا گمان ہے کہ انفسنا سے
حضرت علیؓ مراد ہیں لیکن تمام محققین مفسرین اس کے خلاف ہیں تفسیر طبری میں ہے ہم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ انفسنا سے حضرت علیؓ
مراد ہیں بلکہ اس لفظ سے خود ذات بابرکت سید الوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہے تفسیر بیضاوی میں انفسنا کا مطلب بتایا ہے
ہم خود اور تم میں سے ہر شخص اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کے عزیز لوگوں کو بلا لے۔ تفسیر البحر المحیط ابن حیان اندلسی میں لکھا ہے کہ اگر
کے علاقی مباہلہ پر آمادہ ہوتے تو آنحضرتؐ صحابہ کو حکم دیتے کہ اپنے اہل و عیال کو لیکر مباہلے کے لئے آئیں لغت کے اعتبار سے انفس جمع ہے
نفس کی اور ہر شخص کا نفس اس کی ذات کو کہتے ہیں نہ کسی دوسرے کو۔ پھر جمع کے لفظ سے واحد شخص مراد لینا بھی جائز نہیں الا مجازاً [illegible] علیہ
کیلئے بھی اپنا نساء اور انفس کے الفاظ اپنے عموم پر ہیں اور لغوی معنی میں مستعمل ہیں اس لئے ان کے حق میں بھی یہی معنی مراد لئے جائیں گے اگر
نساء سے بیٹی اور انفس سے داماد مراد لیا جائے تو خطاب انہی سے ہوتا ہے بیٹی اور داماد [illegible] کا مطالبہ ہو جاتا
تھا حالانکہ یہ خیال باطل ہے۔ اہل نجران نے دعوت مباہلہ سن کر مہلت لی کہ ہم آپس میں مشورہ کرکے جواب دیں گے آخر
باہمی مشاورت [illegible] سے زیرک اور معاملہ فہم [illegible] نے کہا کہ اے گروہ نصاریٰ! تم یقیناً دل میں سمجھ چکے ہو کہ محمد نبی
مرسل ہیں اور حضرت عیسیٰ کے متعلق انہوں نے صاف صاف فیصلہ کن باتیں کہی ہیں تم کو معلوم ہے کہ خدا نے حضرت اسماعیلؑ کی اولاد میں نبی کے
[illegible] کا وعدہ کیا ہے [illegible] یہ وہی نبی ہو تو [illegible] ان سے مباہلہ کر کے عذاب الٰہی میں گرفتار ہو کر ہلاک ہو
جائیں۔ الغرض خبر مباہلہ کی یہ لوگ صلح کرکے واپس چلے گئے

آل محمد سے متعلق کتاب [illegible] قرآن حکیم کا آخری [illegible] یہ ہے کہ رسول اللہ کسی کے صلبی باپ نہیں ہیں وہ اللہ کے
رسول ہیں اور چونکہ رسول روحانی [illegible] کے باعث روحانی باپ ہوتا ہے اس لئے آنحضرتؐ کے تمام [illegible] آنحضرت کی
آل ہیں اور آنحضرتؐ کی ازواج مطہرات مسلمانوں کی مائیں کہلاتی ہیں جو یہ ثبوت ہے کہ آنحضرتؐ کے بعد کسی سے ان کا نکاح حرام [illegible]

قبرِ اویس پر ہے بس فخر اب قرن کو
لیکن اویس کوئی باقی نہیں قرن میں
(حالی)

اویس قرنی رضؓ

سید بشیر احمد سعدی ہاشمی

مکتبہ پاکستان
چوک انارکلی لاہور